جامعہ مدنیہ لاہور کا علمی، دینی اور اصلاحی مجلہ

انوارِ مدینہ

سرپرست

استاذ العلماء حضرۃ مولانا سید حامد میاں مدظلہ مہتمم و شیخ الحدیث جامعہ مدنیہ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

ماہنامہ

انوارِ مدینہ

لاہور

قیمت : ۵۰ پیسے

فون : ۶۲۹۳۲

مدیرِ اعزازی : پروفیسر یوسف سلیم چشتی
مدیرِ معاون : حبیب الرحمٰن اشرف

جلد ۱ ذی قعدہ ۱۳۹۰ھ * جنوری ۱۹۷۱ء شمارہ ۸

مرتّب : اشرف

بدل اشتراک : سالانہ ــــ ۵ روپے (طلبہ کیلئے ــ ۴ روپے) فی پرچہ پچاس پیسے

سید حامد میاں مہتمم جامعہ مدنیہ طابع و ناشر نے مکتبہ جدید پریس لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ انوار مدینہ جامعہ مدنیہ کریم پارک لاہور سے شائع کیا

اس شمارہ میں

اداریہ		۳
تقریر دلپذیر	حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب مدظلہ،	۴
اولٰئک ہم الراشدون	حضرت مولانا سید محمد میاں مدظلہ،	۱۶
بحضور رحمۃ عالم	حضرت سید سلیمان ندوی رح	۲۱
حیات شیخ الاسلام رح	حضرت مولانا سید محمد میاں مدظلہ،	۲۲
قربانی	حضرت مولانا قاری محمد طیب مدظلہ،	۲۹
فصل لربک وانحر		۳۸
خوابگہِ قطب الارشاد رح	حضرت سید انور حسین نفیس رقم مدظلہ،	۴۲
عید	حضرت مولانا سید محمد میاں مدظلہ،	۴۵
عید کس کی ہے۔	وفا ملک پوری	۴۹
ایک مقدس تقریب کی روداد		۵۰
احکام عید الاضحیٰ	حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن قدس سرہ	۵۳

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

مرحلۂ آئین سازی

اس وقت ملک میں آئین سازی کا مرحلہ ایک عظیم مرحلہ ہے بس اب قوم کے منتخب نمائندوں کا یہی امتحانی دور ہے۔ اسی کے لیے انتخابات پورے زور شور سے لڑے گئے۔ اب قوم کی نظریں مجیب اور بھٹو پر ہیں۔ کہ یہ قوم کے لیے کیا کرتے ہیں۔ ادھر "اسلام" بھی کڑی نظریں رکھے ہوئے ہے کہ یہ مختلف انداز سے میرا نام لینے والے میرے لیے کیا کام کرتے ہیں۔ مساوات محمدی اور اسلامی نظام کا نام لے کر انہوں نے صحیح اور سچی بات کی تھی۔ یا یونہی وقت گذاری مقصود تھی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح راہ پر قائم رکھے۔ آمین

حامد میاں

حضرت مدظلہم کی حج کو روانگی

مخدومنا المکرم حضرت مولانا سید حامد میاں مدظلہم ۳۰ر جنوری ۱۹۷۱ء کو بارادۂ حج لاہور سے کراچی تشریف لے گئے ——— ۲ر فروری کو کراچی سے وہاں کے احباب کے ساتھ بذریعہ ہوائی جہاز حجاز مقدس تشریف لے جائیں گے۔ انشاء اللہ وسط مارچ میں واپس لاہور تشریف لے آئیں گے۔ ہم حضرت مدظلہم کی خدمت میں اس سعادت سے بہرہ مند ہونے پر صمیم قلب سے مبارک باد پیش کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ آپ اپنے خدام کو دعاؤں میں فراموش نہ فرمائیں گے۔ ——— (ادارہ)

جامعہ مدنیہ میں ختم بخاری کے مبارک موقع پر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ صاحب مدظلہ، مہتمم دارالعلوم دیوبند کی

تقریر دلپذیر

فضیلتِ بخاری

درجاتِ اخلاق

حقیقتِ محمدیہ

قسط اوّل

تحریر اشرف

بزرگانِ محترم و برادران عزیز و عزیز طلبہ!

جہاں تک ختم بخاری کا تعلق تھا وہ ہوگیا۔ اور اس کا حق بھی ادا ہوگیا۔ آخری حدیث پڑھی گئی اور دعاء بھی ہوگئی۔ امام بخاریؒ نے اپنی بخاری کی نسبت (اپنی کتاب کے بارے میں) فرمایا کہ جعلتہ بینی وبین اللہ حجۃ۔ میں نے اس کتاب کو اپنے اور اپنے اللہ کے درمیان "حجۃ" بنایا ہے۔ اس کا ایک ثمرہ یہ ہے کہ ختم بخاری کے بعد جو دعائیں مانگی جاتی ہیں، تو تجربہ بھی شاہد ہے، امت کا عمل بھی ہے کہ وہ دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ اس لیے عامۃً علماء میں یہ دستور رہا ہے، کہ جب بخاری ختم ہوتی ہے، تو مجمع ہوجاتا ہے ختم کرکے دعائیں مانگتے ہیں۔

اب تو یہ سسٹم ذرا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ باہر سے بھی لوگ بلائے جانے لگے ہیں۔ لیکن ہم لوگ طالب علمی کے زمانہ میں دیکھتے تھے کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ یا حضرتِ اقدس مولانا انور شاہؒ جب بخاری ختم کراتے تھے تو باہر سے کسی کو نہیں بلایا جاتا تھا۔ لیکن دارالعلوم کے اساتذہ، طلبہ، منتظمین

سب جمع ہو کر ختمِ بخاری میں شریک ہوتے۔ یہ سلسلہ اب تک بھی جاری ہے کہ جب بخاری ختم ہوتی ہے۔ تو دارالعلوم کے لوگ اور شہر کے لوگ بھی، اطلاع پانے پر آجاتے ہیں۔ اور دعاء میں شریک ہوتے ہیں۔

بہر حال ختمِ بخاری پر دعاء کا معمول رہا ہے۔ ایک تو درسًا درسًا ختم ہوا۔ اس وقت تو ختمِ بخاری ہوتا ہی ہے۔ دعاء بھی کرتے ہیں۔ ویسے بھی اگر کوئی مہم پیش آجاتی ہے۔ مسلمانوں کو خدانخواستہ کوئی آفت پیش آئی۔ یا کوئی مقصد کسی نے لکھ کے بھیجا، اور چند مقاصد جمع ہو گئے، تو اس کے لیے بخاری کا ختم کرائے جانے کا مدارس میں، اور دارالعلوم میں بھی معمول ہے۔ متعدد مقاصد درخواستیں جمع ہوتی ہیں، تو ایک دن اساتذہ اور طلبہ جمع ہو کر ختم کرتے ہیں۔ اور دعائیں مانگتے ہیں اور اس کے اثرات بھی دیکھے گئے ہیں کہ حق تعالیٰ قبول فرماتے ہیں۔ اور نتائج بھی ظاہر ہوئے ہیں۔

تو بہر حال یہ ایک تجربہ ہے۔ اور امام بخاریؒ نے اس کتاب مقدس کو اپنے اور اپنے اللہ کے درمیان میں "حجت" ٹھہرایا۔ اور "حجت" ہونی بھی چاہیئے تھی۔ اس لیے کہ جس اعتناء اور جس تقدس کے ساتھ بخاری نے اس کتاب کو مدوّن کیا اس کی نظیر بھی دوسرے محدثین میں نہیں۔ حرمِ محترم میں جا کے اس کی تکمیل اور کتابت کی۔ اور فرماتے ہیں کہ ہر حدیث جب میں لکھتا تھا تو لکھنے سے پہلے غسل کرتا تھا۔ دو رکعت نفل پڑھتا تھا۔ اور دعائیں مانگتا تھا کہ اے اللہ! مجھ میں انشراح پیدا فرما۔ جب شرح صدر ہو جاتا تھا تو تب ایک حدیث میں لکھتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بخاری میں تقریباً سات ہزار حدیثیں ہیں یا کم و بیش۔ تو چودہ ہزار نفل پڑھ کر "بخاری" کو قلمبند کیا ہے امام بخاریؒ نے۔ اور ہر حدیث پر "رجوع الی اللہ" کیا ہے۔

تو اول تو حدیث کلامِ مقدس، کلام نبوی ہے۔ پھر مدوّن کرنے والے امام بخاری، جو امیر المؤمنین فی الحدیث ہیں۔ اور اس کی تدوین کے اندر ہر حدیث پر دو دو رکعت نفل پڑھنا حرم محترم میں، تقدس ہی تقدس جمع ہو گیا۔ پھر بھی اگر "حجت" نہ بنتی تو اور کیا ہوتا؟ تو وہ "حجۃ" بنی۔ اور امت میں یہ تعامل جاری ہے کہ ختم بخاری کر کے دعائیں مانگتے ہیں۔ حق تعالیٰ قبول فرماتے ہیں۔ اس لیے میں نے عرض کیا کہ ختم بخاری کا حق تو ادا ہو گیا۔ حدیث بھی پڑھی گئی۔ دعاء بھی مانگ لی گئی۔ اب آگے زوائد کی بات

ہے۔ حدیث کی جہاں تک شرح کا تعلق ہے۔ وہ اساتذہ کرتے ہیں۔ اس کے متعلق مَیں کیا عرض کروں۔ میں تو ان سے بہت زیادہ کم علم ہوں۔ تو وہ بھی حق ادا ہو گیا۔ یا ہو جائے گا۔ کہ استاد جو متعلق ہیں۔ بخاری پڑھانے والے، وہ حدیث کی شرح کر دیں گے۔ اور اگر کسی درجہ میں کوئی شرح مَیں کر سکتا تھا۔ تو تین سال ہُوئے یہاں آ کے شرح بھی کر دی تھی۔ جب بخاری ختم ہوئی تھی۔ مَیں ہی شریک ہوا تھا۔ اس میں تو حدیث پر بھی تقریر ہو گئی تھی وہ آئندہ کے لیے بھی کافی ہے۔

اس وقت تو صرف اظہار مسرت اور اظہار مبارکباد مقصود ہے، اس مقدس جلسے میں۔ کیونکہ جہاں تک انسانوں کا تعامل ہے دو چیزیں خوشی کی اور قابل مبارک باد سمجھی گئی ہیں ایک کسی شئ کا آغاز اور ایک کسی شئ کا اختتام۔

آغاز پر بھی لوگ خوشیاں مناتے ہیں۔ اور شئ کے اختتام پر بھی خوشیاں مناتے ہیں۔ کسی کے یہاں بچہ پیدا ہوتا ہے تو خوشی مناتے ہیں۔ مٹھائی تقسیم کرتے ہیں، جمع ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ آج اس کی انسانیت کا آغاز ہو رہا ہے۔ ابتداء ہو رہی ہے اس واسطے خوشی کرتے ہیں۔ کوئی شخص باغ لگاتا ہے تو پہلا درخت نصب کر کے احباب کو بلاتا ہے۔ مٹھائی تقسیم کرتا ہے۔ اس لیے کہ باغ کا آغاز ہو گیا۔ کوئی شخص دکان کھولتا ہے، تو اکثر اپنے بزرگوں کو بلاتا ہے کہ صاحب! آپ ہی افتتاح کر دیں دکان کی مٹھائی تقسیم ہوتی ہے۔ خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ تو بہر حال آدمی کا آغاز ہو، یا اس کے افعال کا آغاز ہو۔ آغاز ایک خوشی کی چیز ہے۔ اور اسی لیے کسی چیز کی "اوّلیت" کو شرف سمجھا گیا ہے۔ اور اس کو فضیلت مانا گیا ہے۔ جو شخص بھی کسی کام میں ابتداء کرے وہ ایک تاریخی چیز بن جاتی ہے کہ فلاں کام کا یا فلاں بات کا فلاں نے آغاز کیا ہے۔ تو "اولیت" ایک شرف ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل اور مناقب میں جو احادیث آتی ہیں، ان میں "اولیات" کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ حضور ارشاد فرماتے ہیں کہ اول ما خلق اللہ نوری۔ سب سے پہلے اللہ نے میرا نور پیدا کیا۔ ظاہر بات ہے کہ "نُور" سے مراد "حِسّی نور" نہیں ہے۔ جیسے سورج کا نور ہوتا ہے یا چاند کا۔ یہ نور معمولی ہے۔ اس نور کے سامنے کہ جو آپ کا نور ہے۔ وہ نور ہے، حقیقتِ محمدیہ کا۔ یعنی سب سے پہلے

اللہ نے حقیقتِ محمدیہ پیدا کی۔ اور وہ ہے نور۔ یعنی نور بنایا میرا "حسی نور" نہیں ہے۔ "معنوی نور" ہے اور معنوی نوروں میں سب سے زیادہ اکمل ہے "علم" کا نور۔ جس طرح سے کہ حسی نور کے چاند نے میں آپ راستہ پالیتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ یہ چیز اچھی ہے یہ بری ہے۔ اِدھر چلنا چاہیئے ادھر نہیں چلنا چاہیئے نورِ آفتاب میں آپ راہ طے کرتے ہیں۔ اچھے برے کی تمیز کرتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر "نورِ علم" ہے کہ جس میں کسی شئی کی خوبی اور خرابی کو پہچانا جاتا ہے۔ علم کی روشنی میں جائز و ناجائز کی تمیز ہوتی ہے، حلال و حرام کی تمیز ہوتی ہے۔ یہ چیز مرضئ خداوندی اور یہ نامرضئ خداوندی ہے۔ یہ اللہ کی پسند ہے اور یہ ناپسند ہے ان تمام چیزوں کی تمیز ظاہر ہے کہ سورج کے نور میں نہیں ہوسکتی۔ سورج کا نور شکلیں دکھلا دے گا۔ اور "علم" کا نور حقیقتیں دکھلاتا ہے۔ "حقائق" کے اندر امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ تو صورت دکھلا دینا یہ کوئی بڑی چیز نہیں ہے۔ اس لیے آفتاب کا نور بھی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ لالٹین کا نور ہے۔ انڈے کا نور ہے۔ بجلی کا نور ہے۔ اس میں شکلیں، صورتیں، رنگ، الوان پہچانے جاتے ہیں۔ مادی نور ہے۔ مادی چیزیں پہچان لی جاتی ہیں۔ لیکن علم کا نور وہ ہے کہ جس میں حقائق پہچانے جاتے ہیں۔ جس کے اندر شریعتیں پہچانی جاتی ہیں۔ شریعتوں کے احکام کے مراتب قائم ہوتے ہیں۔ احکام کی علتیں پہچانی جاتی ہیں علتوں سے احکام نکالے جاتے ہیں۔ اسرار اور معارف اور حقائق پہچانے جاتے ہیں۔ تو علم کا نور عظیم نور ہے، بہ نسبت آفتاب کے نور کے۔

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت وہ نورِ علم ہے۔ یعنی آپ کی حقیقت میں علم گوندھ دیا گیا ہے۔ اس لیے فرمایا آپ نے کہ اوتیت علم الاولین والاٰخرین۔ اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم مجھے عطاء کر دیئے گئے۔ تو آپ "اَعلم البشر" ہیں۔ کائنات میں نہ وہ علم ملائکہ کو دیا گیا ہے۔ نہ وہ علم انسانوں کو دیا گیا ہے، جو علم نبی کریم کو دیا گیا ہے۔ تو آپ ساری خلائق میں سب سے زیادہ علم والے ہیں اور "اعلم الخلائق" ہیں وہ کیوں ہیں؟ اس لیے کہ آپ کی حقیقت ہی علم سے گوندھ کر بنائی گئی ہے۔ اس لیے آپ کی شریعت علم سے لبریز ہے۔ کوئی حکم نہیں ہے جس کے نتیجے میں حکمت نہ ہو۔ کوئی نقل نہیں ہے کہ جس کے اندر عقل چھپی ہوئی نہ ہو۔ کوئی صورتِ حکم نہیں ہے کہ جس کے اندر حقائق تہ بہ تہ جمی ہوئی نہ ہوں۔

حرف حرفش راست اندر معنیٔ معنیٔ در معنیٔ در معنیٔ

ایک ایک حرف کے اندر حقائق کے دریا چھپے ہوئے ہیں۔ قرآن کریم آپ پر معجزہ بنا کر بھیجا گیا۔ وہ علمی معجزہ ہے۔ تو قرآن کی حقیقت علم سے لبریز ہے۔ تو ذاتِ نبوی خود علم سے گوندھی ہوئی ذات ہوئی۔ شریعت دی گئی جو علم سے لبریز ہے۔ کوئی حکم ایسا نہیں کہ جس کی حجت اور جس کی حقیقت اور جس کی ملیت موجود نہ ہو۔ اس لیے آپ نے ارشاد فرمایا، بحکم خداوندی کہ علیٰ بصیرۃ انا ومن اتبعنی وسبحان اللہ وما انا من المشرکین۔ میں اور میرے ماننے والے دین کے بارے میں بصیرت پر ہیں یعنی اسلام چند بندھی رسوم کا مجموعہ نہیں ہے کہ چند رسمیں ادا کرلیں۔ آدمی مسلمان ہوگیا یہ نہیں ہے بلکہ حقائق سے لبریز دین ہے جو اس دین پر واقفیت حاصل کرے گا تو علوم اور کمالات سے بھر جائیگا۔ وہ اور دنیا اور آخرت کے سارے راز اور حقیقتیں اس پر کھلیں گی۔

تو بہرحال نبی خود جامع العلوم ہیں اور اسی لیے آپ کو خاتم النبیین بنایا گیا۔

ختمِ نبوت کے معنی قطع نبوت کے نہیں ہیں کہ نبوت دنیا سے اٹھ گئی ہے۔ ختم نبوت کے معنی تکمیل نبوت کے ہیں کہ نبوت کے جتنے مراتب اور کمالات ہیں، وہ آپ کی ذات پر لاکر جمع کر دیئے گئے۔ اب کوئی درجہ نبوت کا باقی نہیں ہے کہ بعد میں کسی کو نبی بنا کر لایا جائے۔ اور ان درجات کو ظاہر کیا جائے۔ سارے کمالات نبوت کے۔ علمی ہوں۔ اخلاقی ہوں۔ عملی ہوں۔ وہ سب آپ کی ذات بابرکات پر ختم کر دیئے گئے۔ انتہاء ہو گئی ان کی۔ تو آپ منتہاء ہیں سارے کمالاتِ نبوت کی۔

اخلاق کو دیکھو تو آپ صابر ہی نہیں بلکہ سید الصابرین ہیں۔ آپ شاکر ہی نہیں بلکہ سید الشاکرین ہیں آپ فقط حیا والے نہیں ہیں بلکہ سارے حیاء والوں کے سردار ہیں۔ اور حیاء کے سارے مراتب آپ میں جمع ہیں۔ غیرت اور حمیت اور شجاعت اور سخاوت جتنے بھی اعلیٰ ترین اخلاق ہیں، ان سب کا منتہاء ہیں۔ کہ تمام درجاتِ اخلاقی آپ پر لاکر ختم کر دیئے گئے اسی لیے فرمایا گیا کہ وانک لعلیٰ خلق عظیم۔ آپ خلق عظیم کے اوپر ہیں۔ اس لیے کہ اخلاق میں اگر غور کیا جائے تو تین مرتبے نکلتے ہیں ایک "خلق حسن" ایک "خلق کریم" اور ایک "خلق عظیم"۔ "خلق حسن" کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امر کیا گیا حق تعالیٰ

نے فرمایا یا خلیلی حسّن خلقك ولو مع الکفار۔ اے میرے خلیل! حسن اخلاق سے پیش آؤ۔ چاہے کفار ہی تمہارے سامنے کیوں نہ ہوں۔ دوسرا درجہ ہے "خلق کریم" کا۔ کریم الاخلاق ہونا آدمی کا یہ دوسرا مقام ہے اور تیسرا مقام ہے "خلق عظیم" کا وانك لعلی خلق عظیم۔ ایک حدیث میں آپ نے فرمایا کہ بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔ میں مبعوث کیا گیا ہوں، بھیجا گیا ہوں۔ اس لیے کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں تو کریمانہ اخلاق بھی آپ پر مکمل ہوئے۔ اخلاقِ حسنہ بھی آپ پر مکمل ہوئے اور اخلاق عظیمہ بھی آپ پر مکمل ہوئے۔

کیا معنی ہیں۔ کیا فرق ہے ان تینوں اخلاق میں؟ خلقِ حسن کا معنی ہے عدل و مساوات۔ کہ جو ادھر سے ہو اس کے برابر ادھر سے ہو۔ اگر آپ کے ساتھ کوئی ایک پیسے کا سلوک کرے تو آپ کا فرض ہے کہ ایک پیسے کے برابر آپ بھی سلوک کریں۔ جب کریں گے تو کہا جائے گا کہ انہوں نے خلق حسن برتا، اخلاق حسنہ کا آدمی ہے، کہ بدلہ برابر دیا۔ اس کے برخلاف اگر کسی نے آپ کو تھپڑ مار دیا تو آپ کو حق ہے کہ آپ بھی تھپڑ ماریں۔ اگر تھپڑ سے زیادہ ماریں گے، مکا ماریں گے، تو کہیں گے بدخلق آدمی ہے۔ اسے حق برابری کا تھا کہ دوسرے نے اسکو تھپڑ مارا۔ اسے بھی حق تھا تھپڑ مارنے کا۔ تھپڑ کے بجائے مکا مار دینا یہ بداخلاقی شمار ہوگی، کہ زیادتی کی۔ اس نے اتنی زیادتی نہیں کی تھی۔ جتنی آپ نے کی۔ تو آپ مستحق سزا ہوں گے۔ تو خلق حسن کے معنی عدل و مساوات کے ہیں کہ نیکی اور برائی کے اندر برابر برابر آپ بدلہ لیں۔ یہ ہے خلقِ حسن۔

خلقِ کریم اس سے اگلا مرتبہ ہے۔ خلق کریم یہ ہے کہ آپ کے ساتھ اگر کوئی برائی سے پیش آئے تو آپ برائی سے بدلہ نہ لیں۔ بلکہ معاف کر دیں۔ درگذر کریں۔ یہ خلق کریم ہے۔ اگر بدلہ لے لیا تو خلق حسن ہے بشرطیکہ برابر سرابر بدلہ ہوا۔ اور اگر برائی کو معاف کر دیا تو کہیں گے خلق کریم برتا۔ ایک نے ایک روپے کا احسان کیا تھا آپ نے پانچسو روپے دے دیئے تو کہیں گے خلق کریم کا برتاؤ کیا۔ "کریم النفس" ہے یہ آدمی۔ ورنہ ایک روپے کا بدلہ ایک روپے سے دے سکتا تھا۔ تو بہرحال مساوات سے آگے بڑھ کر کچھ کام کرنا وہ کہلائے گا "خلق کریم"۔ اور تیسرا درجہ خلقِ عظیم کا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر کسی نے برائی کی تو نہ صرف یہ کہ آپ نے بدلہ نہ لیا۔ نہ صرف یہ کہ معاف کر دیا۔ بلکہ اوپر سے برائی کرنے والے کے ساتھ احسان بھی کیا۔ یہ

خلق عظیم ہے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان فرمائی گئی۔ فرمایا گیا کہ خذ العفو و امر بالعرف و اعرض عن الجاھلین اس سے زیادہ فرمایا فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم وہ جو اللہ نے آپ میں کوٹ کوٹ کر رحمت بھر دی ہے۔ اس کی وجہ سے آپ "لین القلب" ہیں۔ قلب مبارک نہایت نرم ہے۔ ذرا سی مصیبت کسی کی دیکھی اور پگھل جاتا ہے۔ قلب رحمت سے بھرپور ہے۔ ولو کنت فظا غلیظ القلب لا نفضوا من حولك فاعف عنھم۔ واستغفر لھم وشاورھم فی الامر اگر آپ سخت دل ہوتے۔ یہ جو آپ کے ارد گرد پروانوں کی طرح لوگ جمع ہیں یہ اُٹھ اُٹھ کر بھاگ جاتے سب۔ آپ کے اخلاق نے جذب کر رکھا ہے انھیں۔ تو کیا ہیں آپ کے اخلاق؟

پہلا درجہ فرمایا گیا کہ فاعف عنھم۔ یہ نہیں کہا گیا کہ برابر سرابر بدلہ لے لیں۔ اگر کوئی برائی کرے تو آپ معافی سے اور ایثار سے کام لیں" فاعف عنھم" آپ معاف کر دیں۔ بدلہ لینے کا تصور نہ کریں۔ بدلہ لینے سے آپ کی ذات بہت بالاتر ہے۔ اگرچہ برابر کا بدلہ لینا وہ بھی خلقِ حسن ہے مگر آپ کے اخلاق اس سے زیادہ بلند ہیں۔ آپ کی ابتداء اخلاق یہ ہے کہ جب کوئی برائی کرے۔ تو آپ معاف کر دیں" فاعف عنھم" اور فقط اسی پر قناعت نہ کریں۔ کہ دوسرا برائی کرے تو آپ معاف ہی کر دیں۔ نہیں۔ واستغفر لھم۔ دُعائے مغفرت بھی کریں اس برائی کرنے والے کے لیے۔ یہ ایک درجہ اور بڑھا دیا۔ واستغفر لھم" کہ دوسرا گالیاں دے رہا ہے اور آپ دعائیں مانگ رہے ہیں اس کی مغفرت کے لیے اور پھر فرمایا گیا کہ آپ کا مقام اس سے بھی آگے ہے۔ فاعف عنھم وشاورھم فی الامر۔ اور کبھی کبھی بلا کے اس سے مشورہ بھی کر لیں۔ وہ تو بُرا بھلا کہہ رہے ہیں۔ آپ مشورہ لے لیں ان سے۔ یہ اس سے بھی اونچا مقام ہے۔ اس مجموعہ کا نام ہے "خلق عظیم"۔ تو خلق عظیم میں خلقِ حسن بھی درج ہے۔ خلقِ کریم بھی درج ہے۔

انبیاء علیہم السلام جامع الاخلاق ہوتے ہیں۔ لیکن تربیت کرنے میں انبیاء علیہم السلام کے درجات ہیں۔ ان درجات میں موسیٰ علیہ السلام کے ہاں درجہ ہے خلق حسن کا۔ جس پر انہوں نے اپنی امت کو تربیت دی ہے۔ اگر تمہارے ساتھ کوئی برائی کرے۔ تمہارا فرض ہے کہ تم برائی کرو۔ اور بدلہ

لو۔ موسوی شریعت کے اندر معاف کرنا جائز نہیں تھا۔ فرمایا گیا وکتبنا علیھم فیھا ان النفس بالنفس والعین بالعین والانف بالانف والاذن بالاذن والسن بالسن والجروح قصاص۔ ہم نے لازم کر دیا تھا اہل تورات پر کہ اگر تمہارے ساتھ کوئی برائی کرے تو معاف کرنا جائز نہیں۔ بدلہ لینا ضروری ہے۔ اگر کوئی دانت توڑے، تمہارا فرض ہے تم بھی دانت توڑ دو۔ کوئی آنکھ پھوڑ دے تمہارا فرض ہے تم بھی آنکھ پھوڑو۔ کوئی تھپڑ مارے تم بھی تھپڑ مارو۔ بدلہ لینا واجب ہے۔ عفو کرنا جائز نہیں یہ ہے موسوی شریعت۔ مگر برابر سرابر۔ تو خلق حسن پہ تربیت دی ہے موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کو۔

عیسیٰ علیہ السلام کا دور آیا انہوں نے خلقِ کریم پر تربیت دی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ شریعتِ عیسوی کے اندر اگر کوئی برائی کرے۔ تو بدلہ لینا جائز نہیں معاف کرنا واجب ہے اس کے لیے۔ وہاں "تشدد" غالب ہے یہاں "تساہل" غالب ہے۔ یہاں آسانی غالب ہے۔ یہاں یہ حکم ہے (جو انجیل کا حکم ہے) کہ اگر کوئی تمہارے بائیں گال پہ تھپڑ مارے تو تم دایاں بھی سامنے کر دو۔ کہ بھائی ایک اور مارتے چلو۔ خدا تمہارا بھلا کرے۔ یہ نہیں کہ بدلہ لو۔ بدلہ لینا جائز نہیں۔ معاف کرنا واجب ہے۔ جھک کر تواضع سے رہنا ضروری ہے۔ اسی میں تمہارے لیے انکسار نفس ہے۔ اسی میں تمہاری اولیت و اولویت ہے۔ تو وہاں خلقِ کریم پہ تربیت کی گئی۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اپنی امت کو تربیت دی ہے۔ وہ خلقِ عظیم پر۔ کہ کوئی برائی کرے تو تم بھلائی کرو اس کے ساتھ۔ ادفع بالتی ھی احسن۔ تم دوسروں کی برائی کا بدلہ اپنی بھلائی سے دو۔ وہ گالیاں دے۔ تو تم دعائیں دو۔

حضرت جنیدؒ جہاز میں سوار تھے۔ اور حج کے لیے جا رہے تھے۔ لوگوں نے ان کے مقام کو نہ پہچانا، کسی نے برا کہا۔ کسی نے گالی دی۔ کسی نے کچھ کہا۔ وہ تو گالیاں دے رہے ہیں۔ اور حضرت جنیدؒ دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اے اللہ ان کو ہدایت دے۔ اور انہیں وہی مقام دے جو مجھے تو نے مقام دیا ہے۔ وہ برائی کے درپے ہیں یہ بھلائی کے درپے ہیں ان کی۔ تو اس شان پہ تربیت دی گئی ہے امتِ محمدیہ کو۔ کہ خلقِ عظیم ان کے اندر آئے۔

عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اخلاق کے تین مراتب ہیں۔ اعلیٰ ترین مرتبہ "خلقِ عظیم" ہے اس کے بعد کوئی مرتبہ نہیں۔ وہ عطاء کیا گیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ تو آپ جامع الاخلاق اور جامع الکمالات ہیں۔ علم بھی اگلوں اور پچھلوں کا آپ کو دے دیا گیا تو آپ جامع العلوم بھی ہیں۔ احوالِ سابقہ سارے آپ کے اُوپر طاری ہُوئے تو آپ جامع الاحوال والشیون ہیں۔ اس لیے آپکو "خاتم" بنایا گیا۔ کہ "منتہا" ہیں۔ آپ کمالاتِ علم کے۔ کمالاتِ عمل کے۔ کمالاتِ اخلاق کے۔ تو نبی کریمؐ کی شان گویا بھرپور ہے کمالات سے۔ اسکو آپ نے فرمایا کہ اول ماخلق اللہ نوری۔ سب سے پہلے میری حقیقت پیدا کی گئی۔ وہ حقیقت علوم اور کمالات سے گوندھی ہوئی ہے۔ مگر عرض کرنا یہ تھا کہ مناقب میں "اولیت" کا ذکر کیا گیا۔ اگر یہی چیزیں بعد میں پیدا کر دیتے کسی اور کو پہنا کر۔ تو کمالات کے جامع آپ جب بھی ہوتے۔ مگر وُہ جو اوّل ہونے کا شرف ہے وہ نہ ملتا۔ تو آپ کو اولیت بھی عطاء کی گئی۔ تو ایک طرف تو "خاتمیت" عطاء کی گئی کہ سب سے اخیر میں آپ ہیں اور ایک طرف "اولیت" عطاء کی گئی۔ تو آپ اول بھی ہیں آخر بھی ہیں۔ کمالات کے درجے میں۔ جیسے اللہ تعالیٰ شانہٗ اپنے وجود اور کمالاتِ ذاتی میں اول بھی ہیں آخر بھی ہیں۔ حضورؐ ان کمالات میں جو اللہ نے عطاء کئے اول بھی ہیں آخر بھی ہیں۔ رجوع آپ ہی کی طرف ہوگا۔ تو "اولیت" ایک عظیم فضیلت ہے۔ یا جیسے آپ نے فرمایا کہ انا اول من تنشق منہ الغبراء سب سے پہلے قبر سے مَیں اٹھونگا۔ اور بعد میں سب کو اٹھاؤنگا۔ آپ اُٹھینگے۔ تو ابوبکرؓ و عمر رضی اللہ عنہما کو اٹھائیں گے۔ اور اس کے بعد فرماتے ہیں کہ جنت البقیع میں جو مدفون ہیں مَیں انہیں اٹھاؤنگا۔ اور اس کے بعد مکہ کی طرف جنت المعلّٰی ہے تو وہاں کے قبرستان سے لوگ اُٹھیں گے اور اور میرے ساتھ ہوں گے سب۔ تو اولیت آپ کے لیے ثابت ہے قبر سے اٹھنے میں۔ انا اول من یفتح باب الجنۃ۔ سب سے پہلے میں ہونگا جو جنت کا دروازہ کھولونگا۔ اس واسطے وہاں بھی آپ ہی کو اولیت حاصل ہے۔ انا اول قائد و انا اول خطیب۔ قیامت کے دن سب سے پہلا قائد میں ہوں گا۔ کہ میری قیادت میں دنیا کی امتیں چلیں گی۔ میں ہی شفاعتِ کبریٰ کروں گا۔ کہ سب امتیں میرے جھنڈے کے نیچے آئیں گی۔ تو جتنی بھی "اولیتیں" ہیں دنیا اور آخرت کی۔ وہ سب

آپ کے لیے ثابت ہیں۔ اس سے معلوم ہُوا کہ "اولیت" ایک عظیم شرف ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ہر چیز کی اولیت پر اور ابتداء پر اور آغاز پر لوگ خوشیاں مناتے ہیں۔ اسی طرح سے دوسرا مقام "اختتام" کا ہے کہ اس پر خوشی منائی جاتی ہے۔ جب کوئی چیز مکمل ہو جاتی ہے۔ تو خوشی مناتے ہیں کہ آج پوری ہو گئی۔ بچہ اگر تعلیم سے فارغ ہو کر سند حاصل کرے۔ آپ ولیمہ کرتے ہیں کہ بچہ فارغ ہو گیا۔ یعنی حدِ اختتام کو اس کا علم پہنچ گیا۔ جو تدریس کا سلسلہ تھا اس میں آخری مرتبے پر آ گیا۔ تو "انتہا" کی بھی خوشی کرتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ بچے کی پیدائش پر تو خوشی کرنا صحیح ہے۔ لیکن اس کا تقاضا یہ ہے کہ جس دن انتقال ہو۔ اس دن بھی خوشیاں منائی جائیں۔ حالانکہ اس دن روتے ہیں۔ خوشیاں کوئی بھی نہیں مناتا۔ تقاضا اس قاعدے کا یہ ہے کہ جب ابتداء میں خوشی کی گئی۔ تو "انتہا" میں بھی خوشی کی جائے۔ مَیں کہتا ہوں کہ "انتہاء" میں بھی آپ خوشی کرتے ہیں۔ موت پر کبھی کوئی رنجیدہ نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض اوقات کہا کرتے ہیں۔ جب اچھی موت ہو۔ کہ بھئی بڑا اچھا آدمی تھا۔ خدا ایسی موت ہر ایک کو نصیب کرے۔ مرنا تو تھا ہی۔ مگر ایسی موت نصیب ہوئی۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ بڑی فرحت کی بات ہے کوئی جامِ شہادت پی لے۔ تو آپ کہتے ہیں کہ بھئی موت تو اپنے وقت پر آتی ہے لیکن شہید ہو کر مرا ہے کتنی خوشی کا مقام ہے۔ اور ویسے بھی "مرنے" کے معنیٰ تو اللہ سے مل جانے کے ہیں۔ تو کیا اللہ سے مل جانا کوئی غم کی چیز ہے۔ کہ اس میں آدمی رنج کرے کہ ہائے فلاں آدمی خدا سے کیوں مل گیا جا کے۔ حدیث میں تو فرمایا گیا ہے کہ اللّٰھم حبب الموت الی من یعلم انی رسول۔ یا اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت ڈال دے جو میرے رسول ہونے کا قائل ہے۔ کیوں ڈالدے محبت؟ کیوں محبوب بنائی گئی موت؟ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب۔ موت ایک پل ہے کہ جس سے گذر کر آدمی محبوبِ حقیقی سے جا ملتا ہے اپنے پروردگار سے جا ملتا ہے۔ تو موت ذریعہ ہے بندے کو خدا سے ملانے کا۔ تو درحقیقت یہ نہیں ہوتا کہ بندہ تو خدا سے مل رہا ہے اور آپ بیٹھ کر رنج کریں اور آہ و فغاں کریں۔ بلکہ حقیقت میں تو موت بھی خوشی کی چیز ہوتی ہے۔ پھر بھی غم جو کرتے ہیں وہ غم موت کا نہیں ہوتا۔

جدائی کا غم ہوتا ہے۔ کہ ہم سے فلاں عزیز جُدا ہو گیا۔ اس پر غم نہیں ہوتا کہ مر کیوں گیا؟ اللہ سے کیوں مل گیا؟ بلکہ ایک نعمت چونکہ ہم سے چھنی۔ غم اصل میں اس کا ہوتا ہے۔ یہ غم اس کی موت پر نہیں ہوتا۔ یہ غم ہوتا ہے فراق کا۔ کہ ہم سے فلاں آدمی چھن گیا۔ ہم سے ایک عالم چھن گیا۔ ہم سے ہمارا دوست چھن گیا۔ تو غم درحقیقت جُدائی کا کرتے ہیں۔ موت کا غم نہیں ہوتا۔ نہ اس کا غم ہوتا ہے کہ بندہ اللہ سے مل گیا۔ لہٰذا موت بھی ایک خوشی کی چیز ہے۔ اور اہل اللہ کے ہاں تو اس سے زیادہ فرحت کی چیز ہی کوئی نہیں۔

ابنِ فارض کہتے ہیں کہ ؎

خرم آں روز کہ ازیں منزلِ ویراں بروم　　تا درے میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

وہ کون سا مبارک دن ہوگا کہ اس اجڑے دیار کو چھوڑیں گے۔ اور اپنے محبوب حقیقی سے جا ملیں گے۔ حضرت بلال رضؓ کی جب وفات کا وقت آیا۔ تو چہرہ کھلا ہوا ہے۔ اور ایسی خوشی تھی چہرے پر کہ عمر بھر اتنی خوشی کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ تو لوگوں نے عرض کیا کہ موت کی تو تکلیف گذر رہی ہے اور چہرہ آپ کا دمک رہا ہے۔ نورانیت برس رہی ہے۔ خوشی ہے فرمایا کہ غداً القی محمداً و اصحابہ بس اب کل کو انشاء اللہ ملاقات ہو گی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے۔ اس میں مگن اور مطمئن ہوں۔ تو موت کی خوشی کوئی ان اہلِ حقیقت سے پوچھے کہ اس گندے عالم کو چھوڑ کر پاکیزہ عالم میں جا رہے ہیں۔ یہاں کے دوستوں کو چھوڑ کر جن کی دوستی مشکوک ہے۔ ان دوستوں میں جا رہے ہیں کہ جن کی دوستی میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ منصور اکثر قبرستان میں رہتے۔ تو لوگ کہتے کہ بھئی! شہروں کو چھوڑ کر قبرستان میں کیوں جاتے ہو؟ تو کہتے کہ میں اس قوم کے پاس رہتا ہوں جو نہ غیبت کرتی ہے نہ جھوٹ بولتی ہے نہ چغلی کھاتی ہے۔ نہ بدخواہی کرتی ہے مرنے کے بعد آدمی کی برائیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور اس کی جتنی نیکیاں ہیں وہ ابھر جاتی ہیں۔ اس لیے آدمی ان سے مل کے خوش ہوتا ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام سے ملے تو اس سے بڑھ کر خوشی کا کیا مقام ہے؟۔ تو عرض کرنے کا مطلب ہے کہ موت بھی خوشی کی چیز ہے۔ اور آپ بھی درحقیقت

خوش ہی ہوتے ہیں۔ مگر اس کے اوپر جدائی کا غم چونکہ طاری ہو جاتا ہے تو وہ خوشی دب جاتی ہے۔ اگر جدائی کی غمی نہ ہوا کرتی تو شاید شادیانے بجایا کرتے لوگ میت کے اوپر۔ کہ بڑا اچھا ہوا اللہ سے جا ملا۔ مگر اس خوشی کے اوپر غالب آجاتا ہے غم جدائی کا۔ اس سے آدمی کے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ تو مطلب یہ ہے کہ دو چیزیں ہیں خوشی کی۔ ایک آغاز اور ایک اختتام۔

آغاز میں تو خوشی ہوتی ہے "توقع" پر۔ ابتداء میں توقع باندھتا ہے کہ آج میں نے بچے کو پڑھنے کے لیے بٹھایا ہے۔ جو امید ہے کہ آٹھ برس میں عالم بن جائے گا۔ اس توقع پر خوشی مناتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہ آج کوئی خوشی میسر آرہی ہے۔ باغ اگر لگاتے ہیں اور اس میں ابتداء میں خوشی کریں تو خوشی توقع کی ہوتی ہے۔ کہ اب چند دن کے بعد یہ پھل دے گا۔ اور ہم اس سے فائدہ اٹھائیں گے تو ابتداء کی خوشی درحقیقت محض توقع پر مبنی ہوتی ہے۔ واقع پر مبنی نہیں ہوتی۔ لیکن انتہاء کی خوشی، وہ واقعات پر مبنی ہوتی ہے۔ کہ آج تکمیل کو پہنچ گئی شئ۔

تو بخاری شریف جس دن آپ نے شروع کی ہوگی۔ اس دن جو خوشی منائی تھی وہ تو اس کی تھی کہ اب امید پڑ گئی کہ ہم سال بھر میں ختم کریں گے۔ "امید" کے اوپر آپ خوشی منا رہے تھے۔ اور جب ختم کی تو ایک واقعہ کے اوپر خوشی منائی کہ حدِ کمال کو پہنچ گئی ہے ایک چیز۔ تو آج گویا ہمارے لیے بڑی خوشی کا دن ہے کہ بخاری ختم ہوئی۔ اور تکمیل کو پہنچ گئی۔ ختم ہونے کا یہاں یہ مطلب ہے۔ کہ مکمل ہو گئی دلوں کے اندر۔ ساری حدیثوں کو عبور کر کے آج اس درجے پر آگئے کہ سات ہزار حدیثوں کے ہم عالم بن گئے۔ بقدرِ استعداد ہم نے علم حاصل کر لیا۔ وہ ہمارے اندر مجتمع ہے۔ تو "اختتام" کے وقت جو خوشی ہوتی ہے وہ تکمیلِ شئ پر ہوتی ہے۔ اور ابتداء میں خوشی محض توقعات پر ہوتی ہے۔ وہاں وجود نہیں ہوتا کسی شئ کا۔ اس لیے اصل خوشی ہے اختتام کی۔ تو آج خوشی کا دن ہے۔ بخاری ختم ہوئی۔

حکیم الاسلام مدظلہ، کی حکیمانہ تقریر کی دوسری قسط اگلے شمارہ میں طبع ہو رہی ہے۔ تقریر کے زیر طبع حصہ میں "سند" کی اہمیت اور "مستند علماء" کی فضیلت کا بیان ہے۔

فتنوں کی سرکوبی

قسط : ۳

اولئک ھم الراشدون

خلافت وملوکیت کے جواب میں

شیخ الحدیث حضرۃ مولانا سیّد مُحمّد میاں دامت برکاتہم

آپ نے اس کو برداشت کر لیا کہ لوگ آپ کا خُون بہائیں مگر آپ نے اس کو برداشت نہیں کیا کہ آپ کی موجودگی میں آپ کی طرف سے کسی کے خون کا کوئی ایک قطرہ بھی زمین پر گرنے پائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز کوہ احد پر تشریف لے گئے۔ حضرت ابوبکر حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم آپ کے ساتھ تھے۔ پہاڑ میں حرکت پیدا ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پائے مبارک پشتِ کوہ پر مارا۔ اور فرمایا اسکن احد لیس علیك الا نبی وصدیق وشہیدان (بخاری شریف صہ ۵۲۳) احد! ساکن ہو جا۔ تیرے اوپر کوئی نہیں ہے۔ ایک نبی ہے۔ ایک صدیق ہے۔ دو شہید ہیں (عمر عثمان رضی اللہ عنہما)

کوئی چشم بصیرت رکھتا ہو وہ ان شہادتوں کو دیکھے ان کی اہمیت کو سمجھے۔ پھر غور کرے۔ کیا کوئی ایسا شخص اس عظیم الشان بشارت کا (جس میں پوری امت کے صرف تین بزرگ شریک ہیں) مستحق ہو سکتا ہے۔ جو بقول مودودی صاحب۔

۱۔ معیار مطلوب کو پورا نہ کر سکا ہو (خلافت وملوکیت صہ ۹۹)

۲۔ جس نے اپنے عہد میں بنی امیہ کو کثرت سے بڑے بڑے عہدے اور بیت المال سے حصے دیئے ہوں۔ جس سے دوسرے قبیلوں نے تلخی محسوس کی ہو۔ (ایضاً صہ ۹۹)

(یعنی جس نے فرائضِ خلافت دیانتداری سے پورے نہ کئے ہوں۔ جس نے مسلمانوں کی حق تلفی اور بیت المال کے مال میں خیانت کی ہو کہ اپنے رشتہ داروں کو بڑے بڑے عطیے دیئے ہوں)۔

۳۔ جس نے ایسی پالیسی اختیار کی جو بلحاظ تدبیر نامناسب بھی تھی اور عملاً نقصان دہ بھی ثابت ہوئی صـ ۳۲۲

۴۔ جس نے اکابر صحابہ کو ان کے عہدوں سے معزول کر دیا ہو۔ اور قرابت کی بناء پر کم درجہ کے لوگوں کو ان بڑے منصبوں پر فائز کر دیا ہو۔ (صـ ۱۰۰ تا صـ ۱۱۶)

جس نے خلافت کی بنیاد میں قبائلیت کی وہ بارود بھر دی ہو جس نے خلافت راشدہ کے نظام کو پھونک کر رکھ دیا ہو۔ (صـ ۱۰۰)

محترم مودودی صاحب! گستاخی معاف ہم جیسے لوگ مصلحت پرست ہو سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ کسی کو خوش کرنے کے لیے مدحیہ قصیدہ لکھ دیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ کسی فریق کی خوشنودی کے لیے کوئی کتاب تصنیف کر دیں۔ مگر کیا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول بھی ہماری طرح مصلحت پرست تھے۔ کہ ایسے شخص کو جس میں یہ نقائص موجود ہوں۔ وہ بشارت دے دیں جو ہزاروں صحابہ اور امت کے لاکھوں کروڑوں علماء فضلاء مشائخ طریقت اولیاء اللہ میں صرف دس کو دی گئی ہو۔ مزید برآں اس رتبہ کا مژدہ سنا دیں جو صرف تین کو سنایا گیا ہو۔ جن کی وجہ سے زلزلہ پذیر پہاڑ بھی ساکن ہو گیا ہو۔

اب اگر وہ شہادتیں صحیح ہیں جن میں سے چند شہادتیں اوپر بیان کی گئیں اور ان شہادتوں کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے مقدس رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے معاذ اللہ چاپلوسی اور بے جا خوشامد سے کام نہیں لیا۔ بلکہ وہ بشارتیں ایک واقعی اور حقیقی حیثیت کا اظہار ہیں تو لامحالہ وہ تمام روایتیں غلط ہیں جن سے آپ نے مذکورہ بالا نتائج اخذ کئے ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی کوتاہیاں اور غلطیاں شمار کرنے کے بعد آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس ایک پہلو کو چھوڑ کر باقی جملہ پہلوؤں سے ان کا کردار بحیثیت خلیفہ ایک مثالی کردار تھا۔ (صـ ۱۱۶)

پھر آپ نے چند اوراق میں (از صـ ۳۲۱ تا صـ ۳۲۸) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے طرز عمل کی تشریح بھی فرمائی ہے۔ جس پر آپ نے ان الزامات کو زیادہ شدت و حدت کے ساتھ دہراتے ہوئے یہ معذرت فرمائی ہے۔

" یہ نیت کی غلطی نہیں بلکہ رائے کی غلطی یا بالفاظ دیگر اجتہادی غلطی تھی ۔ (ص ۳۲۱)

شاید مودودی صاحب نے انہیں بشارتوں کے پیش نظر یہ معذرت فرمائی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ اجتہادی غلطی کی بناء پر یہ کام ہوئے تو اس سے حضرت عثمان کے مرتبہ اور درجہ میں فرق نہیں آیا۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اجتہادی غلطی کی بناء پر یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ غلطی کرنے والے کی عند اللہ گرفت نہیں ہوگی۔ اور اگر گرفت ہوئی بھی تو معافی ہو جائے گی۔ لیکن مقبولیت عند اللہ کی شان اس سے بہت بلند ہے۔

اجتہادی خطاکار کو گنہگار نہیں کہا جا سکتا مگر ایسا شخص مقبول عند اللہ بھی نہیں ہو سکتا۔ مقبولیت بھی ایسی کہ پوری امت میں صرف تین حضرات کو حاصل ہوئی ہو۔

ضمیمہ میں ایک عنوان یہ بھی ہے کہ غلطی کے صدور سے بزرگی میں فرق نہیں آتا (ص ۳۰۷)

ہم یہ تو تسلیم نہیں کرتے کہ بزرگی میں فرق نہیں آتا۔ اگر کوئی فرق نہیں آیا تھا تو غزوہ تبوک میں شریک نہ ہونے پر حضرت کعب بن مالک اور ان کے دو ساتھیوں کو وہ مشہور کفارہ کیوں ادا کرنا پڑا کہ پچاس روز تک کا مقاطعہ کیا گیا حتیٰ کہ توبہ قبول ہوئی اور معافی کی بشارت نازل ہوئی۔ (سورہ توبہ)

نیز واقعہ بنی قریظہ میں حضرت لبابہ نے اپنے آپ کو کھمبے سے کیوں باندھ دیا۔ البتہ ہم یہ مانتے ہیں کہ غلطی کا صدور بزرگی کے منافی نہیں ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے سوا معصوم کوئی نہیں حضرات صحابہ سے بھی غلطیاں ہوئی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ غلطیوں کو سر تھوپنا کہاں تک درست ہے۔ اس تصنیف کا شاہکار یہی ہے کہ آپ نے غلطیوں کو سر تھوپا ہے۔ اور ان واقعات پر پردہ ڈال دیا ہے جو ان غلطیوں کی تردید کرتے ہیں۔ حالانکہ مذکورہ بالا آیات اور بشارات کا تقاضا تھا کہ آپ تردید کرنے والے واقعات کے بیان میں قلم کا وہ زور صرف کرتے جو آپ نے غلطیوں کے ثابت کرنے میں صرف کیا ہے۔

آخر میں آپ اس بشارت کو بھی سامنے رکھیئے جس کا تذکرہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس شورش کے زمانہ میں بار بار فرمایا۔ بالآخر اسی بشارت کی سرشاری میں جان عزیز قربان کر دی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: یا عثمان لعل اللہ یقمصك قمیصا فان ارادوك علی خلعہ فلا تخلعہ لھم (ترمذی شریف ج ۲ ص ۲۱۲)

اے عثمان! امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ایک قمیص پہنائے گا پھر اگر وہ لوگ تمہارے اوپر سے اس قمیص کو اتار دینے کا ارادہ کریں تو ان کے (کہنے پر) تم اس قمیص کو نہ اتار دینا۔

جن ایام میں آپ محصور تھے اور بلوائیوں نے آپ کے دولت کدہ کو گھیر لیا تھا۔ خود آپ نے بھی فرمایا تھا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عھد الی عھدا فانا صابر علیہ (ترمذی شریف ص ۲۱۲)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ایک وعدہ لیا تھا۔ میں اس پر جما ہوا ہوں۔

کیا معمولی عقل وفہم کا انسان جس کو اللہ تعالیٰ نے دولتِ ایمان سے نوازا ہو یہ تصور کر سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے شخص کو اپنے منصب پر قائم رہنے کی تاکید فرمائی ہو جس نے اپنے منصب کا غلط استعمال کیا ہو۔ اور معیار مطلوب کو پورا نہ کر سکا ہو۔ جس نے اکابر صحابہ کو معزول کر کے اپنے رشتہ داروں کو ان کی جگہ بھرتی کیا ہو۔ اور ان کو من مانے عطیے دیئے ہوں۔ جس نے خلافت راشدہ کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہوں۔

حضرات مؤرخین نے تقریباً متفقہ طور پر سیدنا حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر حضرت محمد بن مسلمہ وغیرہ صحابہ اور بہت سے تابعین سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لشکروں پر لعنت بھیجی جو مقام ذی مُروہ۔ ذی خشبؓ اور مقام اعوص پر پڑاؤ ڈالیں گے۔ یہی مؤرخین بالاتفاق بیان کرتے ہیں کہ انہیں لشکروں نے جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بلوا کیا تھا۔ ان مقامات پر پڑاؤ ڈالا تھا۔

کسی بھی صاحب ایمان کے لیے ممکن ہے کہ وہ یہ تصور کر سکے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خیانت اور صرف بے جا جیسے کبائر کے مرتکب ہوں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنہوں نے طائف کے کفار پر بھی لعنت نہیں بھیجی تھی۔ وہ ان بے قصور لشکروں پر لعنت فرمائے۔ جنہوں نے ایک خائن ومجرم خلیفہ کی اصلاح کے لیے قدم بڑھایا تھا اور اپنے آپکو جنگ کے خطرات میں مبتلا کیا تھا۔

ہمارا ایمان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور کتاب اللہ کی آیات صحیح ہیں ان کے مضامین صحیح ہیں۔ ان کے مضمرات صحیح ہیں۔ لہٰذا ہمارا ایمان یہ بھی ہے کہ وہ تمام روایتیں غلط اور موضوع ہیں۔ جن کا مفاد اور مضمون آیات و احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہو۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ایک صاحبِ ایمان کے لیے ہمارا یہ جواب کافی ہے اور ضرورت نہیں کہ تاریخی روایتوں کی تحقیق، تنقید اور تاریخی واقعات بیان کرنے کی طوالت برداشت کی جائے۔ لیکن اس سے ان کو اطمینان نہیں ہوگا۔ جن کے ذہنوں کو یہ تاریخی روایتیں متاثر کر چکی ہیں اور ممکن ہے ہمارے سکوت کو وہ فرار قرار دیں۔

علاوہ ازیں مودودی صاحب کی شیعیت نواز ذہنیت نے تاریخی واقعات کے بیان میں جو مجرمانہ کوتاہی بلکہ خیانت کی ہے اس کا بھی اظہار نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ بشارتوں سے ہٹ کر تاریخ پر بھی نظر ڈالیں۔ لہٰذا آئندہ صفحات میں تاریخی حقیقتیں پیش کی جائیں گی۔ (انشاء اللہ تعالیٰ) مگر اس معذرت کے ساتھ کہ ہم مودودی صاحب کی سنت پر عمل نہیں کر سکیں گے۔ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جیسے مقدس صحابی کے متعلق شیعی فکر کے بموجب ایک رائے پہلے قائم کر لیں اور صرف ان روایتوں کو پیش کریں جو اس رائے اور فکر کی تائید کرتی ہوں۔ اس کے برخلاف ہمارا فعل یہ ہوگا کہ کتب تاریخ میں جو واقعات آئے ہیں۔ وہ بلا کم و کاست بیان کریں گے۔ اور نتیجہ وہ اخذ کریں گے جو خود یہ واقعات اپنی زبان سے بیان کریں گے۔

یہ بات مودودی صاحب بھی مانتے ہیں کہ اس تحریک (شورش) کے علمبردار کوفہ بصرہ اور مصر سے تعلق رکھتے تھے۔ ان تینوں مرکزوں کے حالات اتنے طویل ہیں کہ ان کی طوالت مطالعہ کرنیوالوں کے لیے بھی ناقابل برداشت ہوگی۔ ہم صرف ایک مرکز یعنی "کوفہ" کو نمونہ بناتے ہیں۔ اہلِ حق اور انصاف پسند حضرات اسی نمونہ پر باقی مرکزوں کو قیاس فرمالیں۔

ہم کوفہ کو اس لیے بھی منتخب کرتے ہیں کہ فتنہ کا آغاز اسی کوفہ سے ہوا اور ولید بن عقبہ جن کی شخصیت سب سے زیادہ قابلِ اعتراض ہے ان کا مسکن اسی کوفہ سے تھا۔

بحضورِ رحمتِ عالم

یہ وہ نعتِ مقبول ہے جو مواجہہ نبوی (علیہ التحیات والتسلیم) میں پیش کی گئی اور مقبول ٹھہری - اور حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سکینت کاملہ عطاء فرمادی گئی ، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تذکرہ سلیمان (ارمغان سلیمان)

★★★

آدم کیلئے فخریہ عالی نسبی ہے — مکّی، مدنی، ہاشمی و مطلبی ہے
پاکیزہ تر از عرش و سما جنت و فردوس — آرام گہ پاک رسولِ عربیؐ ہے
آہستہ قدم نیچی نگہ، پست صدا ہو — خوابیدہ یہاں روحِ رسولِ عربیؐ ہے
اے زائرِ بیتِ نبوی! یاد رہے یہ — بے قاعدہ یاں جنبشِ لب بے ادبی ہے
کیا شان ہے، اللہ رے محبوبِ نبی کی — محبوبِ خدا ہے وہ جو محبوبِ نبی ہے

بجھ جائے ترے چھینٹوں سے اے ابرِ کرم آج
جو آگ مرے سینے میں مدت سے لگی ہے

حیاتِ شیخ الاسلام

مختصر حالاتِ زندگی

قسط ۲

حضرت علامہ مولانا سیّد محمد میاں مدظلہ کی تصنیف لطیف "حیاتِ شیخ الاسلام" سے ماخوذ

ولادت باسعادت ۱۹ شوال ۱۲۹۶ھ ۱۱ بجے شب (دوشنبہ و سہ شنبہ کی درمیانی شب) مطابق ۱۸۷۹ء بمقام قصبہ "بانگرمئو" ضلع "اناؤ"۔ تاریخی نام "چراغ محمد"۔

آبائی وطن موضع "الٰہ دادپور" تحصیل "ٹانڈہ" ضلع "فیض آباد"۔

سلسلۂ نسب آپ حسینی سیّد ہیں۔ آپ کا خاندان انیس پشت پیشتر ہندوستان میں آیا۔ والد ماجد حضرت سیّد حبیب اللہ صاحب، سیدنا حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے خلیفہ راشد تھے۔ پاکباز۔ باخدا۔ ذاکر و شاغل۔

والدۂ محترمہ بھی پابند شریعت۔ صابر و قانع۔ ذاکر و شاغل خاتون تھیں۔

برادرانِ محترم اسم بامسمّیٰ حضرت محترم سید حبیب اللہ صاحب اور خاتونِ محترم قدس اللہ سرہما کی خوش نصیبی قابلِ رشک ہے کہ خداوندِ عالم نے پانچ فرزند مرحمت فرمائے۔ اور پانچوں فرزند آسمانِ سعادت کے آفتاب و ماہتاب۔

۱۔ مولانا محمد صدیق صاحب۔ سال ولادت ۱۲۹۰ھ۔ سب سے پہلے آپ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔ ۱۳۱۳ھ میں سندِ تکمیل حاصل کر کے ریاضت و مجاہدۂ نفس میں مشغول ہو گئے۔ ۱۳۱۸ھ میں دوبارہ

ہندوستان تشریف لاکر گنگوہ حاضر ہوئے۔ اور امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ پھر مدینہ طیبہ واپس ہوکر ملی اور مذہبی خدمات میں مصروف ہوگئے۔ جنگ جرمنی (۱۴ تا ۱۸ء) میں ترکی حکومت کی زیر حراست ایڈریانوپل میں مقیم تھے۔ وہیں آپ کی وفات ہوگئی۔ آپ کے صاحبزادے مولانا وحید احمد صاحب اس زمانہ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنیؒ کے ہمراہ "مالٹا" میں اسیر تھے۔ رہائی کے بعد ہندوستان تشریف لائے۔ افسوس ۱۹۳۵ء میں جبکہ آپ مدرسہ عزیزیہ بہار شریف میں خدمتِ درس انجام دے رہے تھے، آپ نے وفات پائی۔ آپ کے صاحبزادے عزیزیہ محترم مولوی فرید احمد صاحب و مولوی سعید احمد صاحب دار العلوم میں تعلیم پا رہے ہیں۔

۲۔ حضرت مولانا سید احمد صاحب۔ سال ولادت ۱۲۹۴ھ۔ آپ نے دار العلوم دیوبند سے فراغت حاصل کرنے کے بعد حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ العزیز کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ پھر مدینہ طیبّہ میں قیام فرماکر مراحل سلوک طے کئے۔ مدینہ طیبّہ کے حرم اطہر میں "مدرسۃ الایتام" قائم کیا جس میں شرعیات و دینیات کی تعلیم کے ساتھ صنعت و حرفت کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ حجاز مقدس میں آپ کی ذات بہت غنیمت تھی، اہل حجاز آپ کا بہت احترام کرتے تھے آپ نے اپنی زندگی اہل حجاز کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ افسوس ۱۳۶۰ھ میں آپ کی وفات ہوگئی۔ آپ کی اولاد میں صرف ایک صاحبزادی آپ کی وارث ہیں۔ جو مولانا اسعد صاحب (خلف حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی) سے منسوب ہیں۔

حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی کے چھوٹے بھائی مولانا سید محمود احمد صاحب ہیں۔ جو حجاز میں مقیم ہیں، کچھ عرصہ پیشتر "جدہ" میں "قاضی (جج)" تھے۔ ان کے صاحبزادے مولانا سیّد حبیب احمد صاحب مدرسۃ الایتام کے مہتمم و منیجر ہیں۔

پانچویں بھائی سید جمیل احمد صاحب تھے۔ جو حضرت سے چھوٹے تھے۔ عرصہ ہوا وفات پاگئے۔

طفولیت اور ابتدائی تعلیم

تین سال کی عمر تک والد صاحب کے ساتھ قصبہ "بانگرمئو" میں مقیم

رہے ۔ جہاں آپ کے والد ماجد سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے ۔ جب آپ کی عمر تین سال تھی ۔ والد صاحب پنشن لے کر اپنے وطن "ٹانڈہ" تشریف لے آئے ۔ اور یہیں سکونت اختیار کر لی ۔ ابتدائی تعلیم والد صاحب کی زیر نگرانی ٹانڈہ میں حاصل کی ۔ آپ کے یہاں ایک بکری بھی تھی ۔ جس کے چرانے کی خدمت آپ کے سپرد ہوا کرتی تھی ۔ اور اس طرح رحمۃ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مبارکہ پر عمل کی سعادت قدرتی طور پر آپ کو حاصل ہوتی رہی ۔

دار العلوم میں داخلہ

۱۳۰۹ھ میں جبکہ عمر مبارک ۱۳ سال تھی ۔ آپ کو دیوبند، سیدنا شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کی خدمت میں بھیج دیا گیا ۔ یعنی ایک شفاف آئینہ کو آفتاب جہاں تاب کے سپرد کیا گیا ۔

حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ العزیز کی فراست کاملہ نے اس سعادتِ عظمیٰ کو پہچان لیا ۔ جس کے آثار بشرہٗ مبارک سے نمایاں تھے ۔ مخصوص شفقت کے ساتھ اپنی اولاد کی طرح تربیت شروع فرمائی ۔ اپنی نگرانی میں رکھا اور باوجودیکہ حضرت شیخ الہند کے مشاغل بڑی جماعتوں کو بھی خارج اوقات میں کسی کتاب کے درس کا موقع نہ دیتے تھے ۔ مگر حضرت مولانا حسین احمد صاحب کو ابتدائی کتابیں بھی خود ہی پڑھائیں ۔

نیازمندی

سعادت اور ایثار کی بھی یہ شان تھی کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ الہند کے یہاں سے کسی نے فرمائش کی کہ بھنگی سے نالی صاف کرا دو ۔ بھنگی نہیں ملا مگر نالی صاف ہو کر دھل بھی گئی ۔ معلوم ہوا کہ حسین احمد نے اپنے ہاتھوں سے کیچڑ صاف کیا تھا ۔

تکمیل بیعت اور سفرِ حجاز

صرف سات سال کے عرصہ میں جملہ علوم متداولہ سے فارغ ہو کر قطب العالم امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز سے بیعت بھی ہو گئے ۔ ۱۳۱۶ھ میں والد ماجد قدس اللہ سرہٗ العزیز نے جملہ اہل و عیال سمیت بغرض ہجرت بیت اللہ شریف کا قصد فرمایا ۔ تو آپ بھی ان کی رفاقت میں حجازِ مقدس تشریف لے گئے ۔

امام ربانی مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز نے مراحل سلوک طے کرنے کے لیے اپنے شیخ مرشد یعنی سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز مہاجر مکی کی خدمت میں حاضری کا ایما فرمایا چنانچہ

مکہ معظمہ پہنچ کر مراحل سلوک حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی زیر تربیت طے کیے۔

حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں چند ماہ حاضر رہ کر "دارِ ہجرت" یعنی مدینہ طیبہ تشریف لے گئے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب نے جوارِ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم میں رہ کر وہ تمام فیوض حاصل کیے۔ جو ایک باخدا انسان اس مجمع الجود والکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار مبارک سے حاصل کر سکتا ہے۔

قیام مدینہ۔ کسب معاش۔ دور امتحان

حضرت شیخ الاسلام مدظلہ العالی نے اپنی خود نوشت سوانح میں تحریر فرمایا ہے۔

حضرت والد صاحب مرحوم نے مدینہ منورہ پہونچکر باقی ماندہ رقم کو شرعی حصص کے بموجب ہم لوگوں پر تقسیم کر دیا اور فرمایا۔ میں نے تو ہجرت کی نیت کی ہے۔ اس لیے میں تا زیست یہیں رہوں گا۔ لہذا تم لوگوں کو اختیار ہے کہ یہاں رہو یا ہندوستان چلے جاؤ۔ یہ روپیہ واپسی کے لیے کافی ہے۔

ہم لوگوں نے ہجرت کی نیت نہیں کی تھی، کیونکہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز اور پھر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز نے ہجرت کرنے سے منع فرمادیا تھا۔ اور یہ فرمایا تھا کہ ہجرت کرنے والوں کے امتحانات سخت ہوتے ہیں۔ ان میں اکثر لوگ پھسل جاتے ہیں اور ہجرت توڑ کر اپنے وطن واپس چلے جاتے ہیں اور گنہگار ہوتے ہیں۔ صرف قیام کی نیت کرنا۔ اگر حالات سازگار ہوئے قیام کرنا ورنہ جب جی چاہے واپس ہوجانا۔

حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ العزیز نے تو یہ بھی فرمادیا تھا کہ میں نے بھی ہجرت کی نیت اس وقت کی تھی جب میں ایک مرتبہ بیمار ہوکر زندگی سے مایوس ہوگیا تھا۔ اور فرمایا کہ جس کو صرف دینا مقصود ہو وہ جدہ میں رہے اور جس کو دین و دنیا مقصود ہو وہ مکہ میں رہے اور جس کو صرف دین مقصود ہو وہ مدینہ منورہ میں رہے۔

کیونکہ اسباب معیشت ہندوستانیوں کے لیے خصوصاً اور دوسروں کے لیے عموماً جدہ میں بہت سہل اور آسان ہیں۔ اور مکہ معظمہ میں اس سے زیادہ سہل تھے۔ نیز مکہ معظمہ میں بہت سے ہندوستانی آباد بھی ہیں۔ مگر مدینہ طیبہ میں اسباب معیشت بہت کم اور گرانی بہت زیادہ ہے۔ بہرحال ہم میں سے کسی نے بھی سوائے

حضرت والد صاحب مرحوم کے ہجرت کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ صرف قیام کا ارادہ تھا۔ مگر والد صاحب مرحوم کو اکیلا چھوڑ کر چلا آنا والدہ ماجدہ مرحومہ کو گوارا نہ ہوا نہ کسی اور کو۔ لہٰذا ہم سب نے ایک زبان ہو کر کہا کہ جب تک آپ زندہ ہیں ہم یہاں ہی رہیں گے۔

والد صاحب مرحوم نے فرمایا کہ یہ نقد ہمیشہ کے لیے کافی نہیں ہو سکتا۔ کوئی آمدنی ہندوستان سے ہمیشہ جاری رہنے والی نہیں۔ عموماً اہل مدینہ کا گذران وظائف اور تنخواہوں پر ہے جو ان کو ترکی حکومت یا دوسرے ممالک سے ملتے ہیں۔ اس لیے کوئی ذریعہ معیشت عمل میں لانا چاہیئے۔ چونکہ ملازمت یا دستکاری کی کوئی صورت ممکن نہ تھی۔ لہٰذا قرار پایا کہ تجارت کی جائے۔ چنانچہ باب الرحمۃ اور باب السلام کے درمیان ایک دوکان کرایہ پر لی گئی۔ جس میں پرچونی سامان جائے۔ شکر۔ چاول۔ دال وغیرہ رکھا گیا۔ نیز قرار پایا کہ کھجوروں کی موسم میں کھجور بھر لیے جائیں۔ جو ایام حج میں حجاج کے ہاتھ فروخت کیے جائیں۔ مگر تجربے سے معلوم ہوا کہ آمدنی مصارف کو پورا نہیں کر سکتی۔ لہٰذا میں نے اجرت پر کتابیں نقل کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ عربی خط نسخ میں کتابیں نقل کرتا تھا۔ اور اجرت حاصل کرتا تھا۔ مدینہ منورہ میں اس وقت دو کتب خانے باقاعدہ منظم اور مرتب تھے۔ ایک کتب خانہ شیخ الاسلام، دوسرا محمودیہ۔ ان دونوں میں قلمی نایاب کتابیں بکثرت تھیں۔ مدینہ کے نیز باہر کے آنے والے اہل علم قلمی کتابیں نقل کراتے تھے۔ ان دونوں کتب خانوں میں باہر کتاب لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔

۳ بجے حجازی (مطابق ۹ بجے ہندوستانی) سے ۱۰ بجے حجازی (مطابق ۴ بجے شام ہندوستانی) یہ کتب خانے کھلے رہتے ہیں اور ان کتب خانوں میں بیٹھ کر کتابیں نقل کرتا تھا۔ چونکہ نقل کا وقت کم ملتا تھا۔ علاوہ ازیں دوسرے لوگ بھی یہ کام کرتے تھے۔ لہٰذا آمدنی تھوڑی ہوتی تھی اور بہت وقت خالی رہتا تھا۔ لہٰذا میں نے باقی اوقات میں مشاغل سلوک اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری کر دیا تھا۔ چونکہ ادبیات میں بعض کتابیں باقی رہ گئی تھیں۔ اس لیے مدینہ طیبہ کے مشہور اور معمر ادیب مولانا شیخ افندی عبد الجلیل برادہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کے پاس شام کو کچھ ادب عربی کی کتابیں پڑھنی شروع کر دی تھیں۔ اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ میں ہم تینوں بھائی دیوبند سے آخری طور پر روانہ ہو رہے تھے۔ تو منجملہ دوسرے رخصت کرنے والوں کے خود حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز ساتھ ساتھ اسٹیشن دیوبند تک پیدل تشریف لائے تھے راستہ میں پُر زور طریقہ پر ہدایت فرمائی کہ پڑھانا مت چھوڑنا چاہے ایک دو ہی طالب علم ہوں۔

ذی قعدہ ۱۳۱۸ھ میں حضرت قطب العالم مولانا رشید احمد گنگوہی کے ارشاد کے موافق گنگوہ شریف کا سفر کیا اور ۱۳۲۰ھ ماہ محرم میں واپس مدینہ منورہ پہنچا۔ اس وقت سے سلسلہ تعلیم بڑے پیمانہ پر جاری ہوا (ماخوذ از مسودہ سوانح خودنوشت)۔

پابندی اصول

لیکن زمانہ تدریس میں خودداری کا یہ عالم تھا۔ کہ تمام خانگی پریشانیوں کے باوجود ٹیوشن کی صورت کو کبھی بھی گوارا نہیں کیا۔

حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدنی (جو آج کل جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد کے مدیر ہیں) کا بیان ہے کہ ان کے والد ماجد نے جو مدینہ طیبہ کے کامیاب ڈاکٹر اور ترکی فوج میں فوجی ڈاکٹر تھے) حد درجہ اصرار کیا کہ مولانا حسین احمد مدنی مولانا عبدالحق صاحب کو بطور ٹیوشن تعلیم دیں لیکن عین اس زمانہ میں کہ جب فاقہ کی یہ حالت تھی کہ گھر کے تیرہ آدمی تین پاؤ مسور کے پانی پر قناعت کیا کرتے تھے۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے ٹیوشن گوارا نہیں فرمایا۔ البتہ اس کے لیے آمادہ تھے کہ بلا کسی معاوضہ حسبۃً للہ جیسا کہ حرم اطہر میں اور طلبہ کو درس دیتے ہیں مولانا عبدالحق صاحب مدنی کو بھی درس دیتے رہیں۔ طرفین سے یہ اصرار عجیب تھا۔ اور اسی میں تقریباً چھ ماہ گذر گئے۔ آخر کار ڈاکٹر صاحب نے حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی خودداری اور پابندی اصول کے سامنے سپر ڈالدیا۔ چنانچہ حضرت مدظلہ العالی نے مولانا عبدالحق صاحب کو حسبۃً للہ بلا کسی معاوضہ ابتدائی کتابیں شروع کرائیں۔ لطف یہ ہے کہ باوجود ڈاکٹر صاحب اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے والد ماجد کے تعلقات بہت زیادہ وسیع تھے۔ مگر اندرونی فاقہ اور خانگی پریشانی کی خبر ڈاکٹر صاحب کو بھی اس وقت ہوئی جب کہ وہ دور ابتلاء فراخی اور خوش حالی سے بدل چکا تھا۔

نوجوان علماء کے لیے یہ حقیقت درس آموز ہے۔ کہ حضرت مدظلہ العالی کی عمر مبارک ہنوز تقریباً پچھتر سال ہے۔ یعنی خاص دور شباب و نشاط ہے۔ جس میں یہ اصول کی پابندی۔ یہ خودداری۔ یہ صبر و شکر۔ یہ زہد و تقویٰ اور مجاہدات و ریاضات کی یہ شان ہے۔

۱۳۲۰ھ میں جب مدینہ طیبہ دوبارہ تشریف لے گئے اور سلسلہ درس نے وسعت اختیار کی تو حدیث و تفسیر اور فقہ وغیرہ کی چودہ پندرہ کتابوں کا درس دیتے تھے۔ یہ سلسلہ درس تہجد کے بعد سے شروع ہو کر نماز عشاء تک جاری رہتا تھا۔

(باقی اگلے شمارہ میں)

قربانی

فخر الاماثل حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا عَمِلَ ابْنُ اٰدَمَ مِنْ عَمَلٍ یَّوْمَ النَّحْرِ اَحَبَّ اِلَی اللّٰہِ مِنْ اِھْرَاقِ الدَّمِ وَاِنَّہٗ لَیَاْتِیْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ بِقُرُوْنِھَا وَاَشْعَارِھَا وَاَظْلَافِھَا وَاِنَّ الدَّمَ لَیَقَعُ مِنَ اللّٰہِ بِمَکَانٍ قَبْلَ اَنْ یَّقَعَ بِالْاَرْضِ فَطِیْبُوْا بِھَا نَفْسًا ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی عمل بقرعید کے دن خدا تعالیٰ کو خون بہانے سے زیادہ عزیز نہیں اور وہ قربانی قیامت کے دن اپنے سینگوں اور پاؤں اور کھروں سمیت آوے گی۔ اور بے شک خون قربانی کا زمین پر گرنے سے پہلے ہی جناب الٰہی میں مقبول ہوجاتا ہے پس خوش کرو اس قربانی کے ساتھ اپنا دل۔

محترم بزرگو! یہ حدیث جو میں نے اس وقت آپ کے سامنے تلاوت کی ہے۔ قربانی کے احکام پر مشتمل ہے۔ جو اس وقت تقریر اور خطبہ کا موضوع ہے۔ تقریر تو مختصر ہوگی اس لیے کہ اوّل تو مسئلہ جزوی ہے۔ اور جزئیات میں تفصیل نہیں ہوتی۔ کیونکہ بسط و تفصیل تو اصول میں ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایک عام مسئلہ ہے۔ اور اس سے کوئی مسلمان بھی ایسا نہیں جو واقف نہ ہو۔ قربانی کا عمل کوئی حال کا عمل نہیں، بلکہ صدیوں سے چلا آتا ہے۔ اس لیے بھی اس میں تفصیل کی ضرورت نہیں نہ تو نفس مسئلہ میں تفصیل کی گنجائش ہے اور نہ اس کے عام ہونے کی وجہ سے تفصیل کی ضرورت ہے۔

مسئلے کی شرح سے پہلے ایک اصول سمجھ لیجئے اور یہ اصول جس طرح تکوینی ہے اسی طرح تشریعی

بھی ہے۔ وہ یہ کہ خدا تعالیٰ نے اس کائنات کا ذرہ ذرہ دو چیزوں سے ملا کر بنایا ہے۔ ایک روح، ایک جسم یعنی ہر چیز کی ایک صورت ہے۔ ایک اس کی حقیقت، ایک اس کی ہیئت ہے۔ اور ایک اس کی ماہیت ہے۔ یا یوں کہیئے کہ ایک اس کا ظاہری حصہ ہے۔ اور ایک باطنی، غرض تمام انسان کل حیوانات، نباتات، جمادات کی جہاں ایک صورت ہے وہاں اس کی ایک حقیقت بھی ہے۔ ایک اس کا بدن بھی ہے اور ایک اس کی روح ہے اور ہر بدن میں خدا تعالیٰ نے اس کے مناسب روح ڈالی ہے۔ جب حق تعالیٰ کی توجہ کائنات کی طاقتوں اور بدن بنانے کی طرف متوجہ ہوئی تو یہی اصول مدِّنظر تھا۔ سب سے پہلے انسان ہی کو لیجئے کہ اوّل انسان کا بدن تیار کیا جاتا ہے جس کی ابتداء نطفہ یعنی ایک گندے قطرے سے ہوتی ہے۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح ہے:۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

یعنی ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ یعنی گندے قطرے سے بنایا۔ جو کہ ایک محفوظ مقام میں رہا پھر ہم نے اس نطفہ کو خون کا لوتھڑا بنا دیا۔ پھر ہم نے اس لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا۔ پھر ہم نے اس بوٹی کو ہڈیاں بنا دیا۔ پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا۔ پھر ہم نے ان کو ایک دوسری ہی مخلوق بنا دیا۔ سو کیسی بڑی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے

تو روح ڈالنے سے پہلے ڈھانچہ تیار کیا جاتا ہے۔ جس کی تیاری میں زمین کی قوتیں بھی متوجہ ہوتی ہیں، آسمان کی بھی، آفتاب کی بھی طاقتیں متوجہ ہوتی ہیں۔ اور ہواؤں کی بھی، غرض جب کائنات کی ساری قوتیں مل کر ڈھانچہ تیار کر لیتی ہیں تو اس میں پھر روح ڈال دی جاتی ہے۔ یہی صورت سارے جمادات، حیوانات اور نباتات کی ہے۔

جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ اس کائنات کی کوئی بھی چیز باقی نہیں رہ سکتی جب اس کا بدن اور روح ملے ہوئے نہ ہوں گویا بدن کی بقا موقوف ہے روح پر اور

روح کی بقا بدن پر۔ اگر اپنے بدن کو توڑ پھوڑ کر خستہ و خراب کر دیا یا وہ خود ہی قدرتی طور پر خراب ہو گیا اور اس میں سکت باقی نہ رہی تو پھر اس میں روح نہیں ٹھہرتی بلکہ پرواز کر جاتی ہے۔ اس لیے کہ بدن ہی روح کو سنبھالے رکھتا ہے۔

مثلاً انسان میں اگر روح ہے تو وہ انسان ہے ورنہ لاشہ ہے۔ جو بے کار ہے۔ پھر جس طرح مجموعہ بدن کیلئے مجموعہ روح ہے اسی طرح بدن کے ہر ہر جزو کی ایک روح ہے، جو اسی جزو کے ساتھ رہ سکتی ہے۔ اگر اس جزو کو ختم کر دیا جائے تو یہ روح بھی نہ رہے گی، یہ نہ ہو گا۔ کہ بدن کے ایک جزو کو ختم کر دیں تو اس کی روح کسی دوسرے جزو میں پہونچ جائے مثلاً آنکھ ہے اس کی روح قوتِ بینائی ہے۔ اگر آنکھ پھوڑ دی جائے تو یہ نہیں ہوتا کہ دیکھنے کی قوت مثلاً ناک میں آجائے۔ بلکہ یہ قوت باقی ہی نہیں رہتی اسی طرح ناک ہے اس میں سونگھنے کی قوت ہے وغیرہ۔

غرضیکہ خداوند تعالیٰ نے جس قدر قویٰ پیدا کئے ہیں ان میں قوت اور روح بھی پیدا کر دی ہے اور یہ دونوں مل کر کائنات کا حصہ بنتے ہیں۔ اگر دونوں کو الگ الگ کر دیا جائے تو اسی حقیقت کو "موت" کہتے ہیں۔ اور اس حقیقت سے کائنات کی تمام اشیاء ختم ہو جاتی ہیں۔

ایک دوسرا اصول اور سمجھ لیجئے جو اسی سے متعلق ہے۔ کہ بدن کے اندر جو قوتیں چھپی ہوئی ہیں ان کی پہچان ان ابدان ہی کے ذریعے کی جاتی ہے۔ مثلاً قوت بینائی کی شناخت آنکھ سے کی جاتی ہے اور قوت سماعت کی کان سے۔ غرض یہ صورتیں ان قوتوں کے تعارف کا ایک ذریعہ ہیں۔ اگر یہ صورتیں نہ ہوں تو یہ تعارف ختم ہو جائے۔ اس اصول کا حاصل یہ ہوا کہ بدن ذریعہ ہے روح کی پہچان کا۔

اب تیسرا اصول اور سمجھ لیجئے کہ اگر آپ روح تک کوئی اثر پہنچانا چاہیں تو وہ بدن ہی کے ذریعے پہنچ سکتا ہے۔ اس عالم میں براہ راست روح کو متاثر کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ مثلاً اگر آپ روح پر گرمی کا اثر کرنا چاہیں تو بدن کو آگ کے سامنے لے جائیں، جب پہلے بدن گرم ہو جائے گا۔ اس کے بعد روح کو گرمی پہنچے گی۔ اور اگر ٹھنڈک پہنچانا چاہیں تو آپ بدن پر پانی ڈالیں گے یا اس پر برف ملیں گے یا وضو کریں گے وغیرہ، غرض ہر تاثیر کے لیے بدن ذریعہ ہے، بغیر بدن کے اثرات نہیں پہنچ سکتے۔

تین اصول

تو اب تین اصول معلوم ہوئے کہ بدن سے تین کام لیے جاتے ہیں۔ اوّل روح کے قرار و قیام کا، دوسرے روح کے تعارف کا اور پہچان کا اور تیسرے تاثیر کا اور یہ تینوں باتیں اس قدر ظاہر ہیں کہ ان پر کسی دلیل کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔

اور یہ تینوں اصول جس طرح تکوینی ہیں اسی طرح تشریعی بھی ہیں۔ یعنی اعمال شرعیہ میں بھی ایک صورت ہے۔ ایک روح اور بغیر صورت کے روح کا باقی رہنا ناممکن ہے۔ اسی طرح اگر روح تک کوئی اثر پہنچانا چاہیں تو وہ صورت ہی کے ذریعہ پہنچ سکتا ہے۔ اس کی مثالوں سے شریعت بھری پڑی ہے۔

مثال کے طور پر وضو کو لیجئے کہ اس کی ایک صورت ہے اور ایک روح، اس کی صورت تو وہ خاص ہیئت اور افعال ہیں جو انسان وضو کرنے کے وقت اختیار کرتا ہے۔ یعنی ایک خاص طرح سے بیٹھ کر اعضاء کا دھونا وغیرہ اور یہی ہیئت اس کے تعارف کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ جب آپ وضو کر رہے ہوں تو ہر شخص آپ کو دیکھ کر پہچان لے گا۔ کہ آپ وضو کر رہے ہیں، کھانا نہیں کھا رہے، کیونکہ کھانا کھانے کی ہیئت اور ہے اور ایک اس کی روح ہے۔ یعنی طہارت حاصل کرنا، تاکہ انسان دربار الٰہی میں حاضری کے قابل ہو سکے۔ اور ایک اس کی تاثیر ہے یعنی وہ خاص قسم کا انشراح جو انسان کے قلب میں وضو کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ تو یہ طہارت اور انشرح بغیر وضو کی صورت اختیار کیے کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح غسل کی ایک صورت ہے، یعنی تمام جسم کو دھونا اور ایک اس کی روح ہے یعنی طہارت اور صفائی اور اس کی صفائی اور اس کی تاثیر فرح و انبساط ہے، اب اگر کوئی شخص تمام عمر غسل نہ کرے تو اس کو فرح و انبساط کی وہ خاص کیفیت کبھی بھی نصیب نہ ہوگی۔

الغرض ہر چیز کی روح حاصل کرنے کے لیے اس کی صورت کا اختیار کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح آپ نماز کو لیجئے کہ اس کی صورت، نیت باندھ کر کھڑا ہونا اور رکوع و سجود وغیرہ ادا کرنا ہے اور اس کی روح خدا تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنا اور اپنی عبدیت اور بندگی کا اظہار کرنا ہے تو اگر آپ نماز کی ہیئت اختیار نہ کریں تو بندگی کی یہ خاص صورت کبھی بھی حاصل نہ ہوگی۔ اسی طرح زکوٰۃ اور روزہ

وغیرہ عبادات ہیں کہ ہر ایک کی ایک روح اور صورت ہے۔

تو یہ جو "قربانی" ہے اس کی بھی ایک صورت ہے اور ایک روح۔ صورت تو جانور کا ذبح کرنا ہے اور اس کی حقیقت ایثارِ نفس کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ تقرب الی اللہ ہے تو ظاہر ہے کہ یہ روح بغیر جانور کو ذبح کیے کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ بات پہلے معلوم ہو چکی ہے کہ ہر صورت میں اس کے مطابق روح ڈالی جاتی ہے۔ نماز میں نماز کی روح، زکوٰۃ میں زکوٰۃ کی روح اور قربانی میں قربانی کی روح ڈالی جاتی ہے۔ غرض حق تعالیٰ نے اس کی جو صورت مقرر کر دی ہے وہی اختیار کرنا پڑے گی، تب وہ روح اس میں ڈالی جائے گی۔ اگر وہ کسی چیز کی قربانی طلب کریں تو قربانی دینی ہوگی۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۔ یعنی تم خیر کامل کبھی نہ حاصل کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز خرچ نہ کرو گے۔

اور محبوب چیز مال ہوتا ہے، مال سے بھی زیادہ جانور عزیز ہوتا ہے کیونکہ جاندار ہونے کی وجہ سے اس سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر بے جان چیز ضائع ہو جائے تو آدمی دوسری گھڑ کر بنا سکتا ہے۔ بخلاف جاندار کے اگر فنا ہو گیا تو دوسرا نہیں ملتا اور یہ مال تو ایسی چیز ہے کہ فنا ہو کر ہی نفع پہنچاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کے پاس ایک کروڑ روپیہ رکھا ہوا ہے تو وہ بے کار ہے، اس سے کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کو خرچ نہ کر لے۔ تو جب دینوی منافع اس کو خرچ کیے بغیر نہیں مل سکتا تو "رضائے حق" جو اعلیٰ ترین نفع ہے وہ کیسے بغیر محبوبات کی قربانی کے حاصل ہو سکتی ہے!

اور محبوبات کیا ہیں؟ جان و مال، اولاد و آبرو اور غیرت وغیرہ۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۔ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی جانوں اور مال کو جنت کے بدلہ میں خرید لیا۔

غرض ان میں سے آپ کو ہر چیز لٹانی ہوگی، تب کہیں بندگی کا اظہار ہوگا۔ درحقیقت جنت تو ایمان کے بدلے میں ملے گی اور اعمال تو ایمان کی شناخت کا ذریعہ ہیں۔ جیسے اگر سونا خریدا جائے

تو اس کو کسوٹی پر گھس کر دیکھا جاتا ہے اگر کھرا ہے تو اس کی قیمت ادا کرتے ہیں ورنہ نہیں تو اس جگہ قیمت سونے کی ہوتی ہے ان لکیروں کی نہیں ہوتی جو کسوٹی پر چڑھ جاتی ہیں۔

بس اسی طرح آخرت کے بازار میں جنت کے عوض میں ایمان کی قیمت ادا کرنی ہوگی اور ہمارے یہ اعمال ان لکیروں کی طرح ہمارے ایمان کی پختگی کی علامت ہیں اس لیے جنت حاصل کرنے کی غرض سے ہمیں محبوباتِ نفس کو قربان کرنا لازمی ہے۔ اگر مال خرچ کرنے کا حکم ہو تو جان نثار کرو۔ عزّت کی ضرورت ہو تو وہ بھی قربان کرو، یہی عشق کی پختگی کی علامت ہے۔

ایک صحابی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ "یارسول اللہ! مجھے آپ سے محبّت ہے۔" آپؐ نے فرمایا کہ "سوچ کر کہو کیا کہتے ہو؟" انہوں نے پھر یہی عرض کیا۔ "مجھے آپ سے محبت ہے۔" اور آپ نے پھر وہی فرمایا کہ "سوچ کر کہو کیا کہتے ہو"۔

انہوں نے تیسری بار بھی عرض کیا "مجھے آپ سے محبت ہے۔" تو آپ نے فرمایا کہ "تیار ہو جاؤ مصیبتیں جھیلنے کے لیے فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنے کو اور آفتیں سہنے کو۔"

اور ظاہر بات ہے کہ عاشق اپنی محبت کا ثبوت اس وقت تک نہیں دے سکتا جب تک مصیبتیں نہ جھیلے اس لیے ارشاد ہے۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ۔	یعنی کیا لوگوں کا خیال ہے کہ محض اتنا کہنے سے چھٹکارا ہو جائیگا کہ ہم ایمان لائے اور ان کی آزمائش نہ ہوگی۔
وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْکٰذِبِیْنَ۔	حالانکہ ہم نے آزمایا ان سے پہلے لوگوں کو پس ضرور معلوم کرے گا۔ اللہ تعالیٰ سچے لوگوں کو اور ضرور معلوم کرے گا جھوٹوں کو۔

غرض اصل بیان یہ تھا کہ جس طرح اعمال کی روح ضروری ہے اسی طرح ان کی صورت بھی مطلوب ہے اس لیے کہ دنیا میں صورت اصل ہے اور روح اس کے تابع۔

تو اب یہ بات واضح ہو گئی کہ دنیا میں جس طرح ہر چیز کی بقاء کے لیے صورت کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اعمالِ شرعیہ کی روح کی بقا کے لیے ان کے جسم اور صورت کی ضرورت ہے اگر کوئی شخص کہے کہ اعمال میں اصل تو روح ہے۔ اس لیے روح کو لے لو اور صورت کو چھوڑ دو تو اس کو چاہیئے کہ یہ عمل اپنے اور جاری کرے پہلے اپنے بدن کو ختم کر دے اور خودکشی کرلے کہ بس میں تو اپنی روح کو باقی رکھوں گا ورنہ اگر خود بغیر صورت کے نہیں رہ سکتے تو پھر اعمال شرعیہ میں آخر کیوں یہ عمل جراحی کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ شروع میں معلوم ہو چکا ہے کہ کائنات میں جس طرح مجموعہ بدن کے لیے مجموعہ روح ہے، اسی طرح ہر ہر چیز کی علیحدہ علیحدہ روح بھی ہے۔ جیسے آنکھ میں قوتِ بینائی اس کی روح ہے وغیرہ اسی طرح سارے مجموعہ اعمال کی روح ہے اور پھر ہر ہر عمل کی علیحدہ علیحدہ روح ہے اور اس روح کا نام "تقویٰ" ہے چنانچہ قربانی کے متعلق ارشاد ہے۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاءُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ۔

یعنی خدا تعالیٰ کو قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا ولیکن تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

تو قربانی کی روح بھی تقویٰ ہے۔

سو اگر کوئی یہ کہے کہ جب قربانی سے تقویٰ مقصود ہے تو پھر قربانی کی کیا ضرورت ہے بلکہ تقویٰ اختیار کر لو۔ تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ پھر سارے اسلام کو چھوڑ کر بس تقویٰ ہی اختیار کر لو کیونکہ روزہ کے متعلق ارشاد ہے:۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔

تو روزہ کا حاصل بھی تقویٰ ہی ہے۔

نماز کے متعلق ارشاد ہے:۔

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ

یعنی نماز بے حیائی اور بُرے کاموں سے روکتی ہے۔

پھر ارشاد ہے:۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ

سارا کمال اسی میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کو کر لو یا

وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ.

یا مغرب کو لیکن کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتب پر اور پیغمبروں پر اور مال دیتا ہو اللہ کی راہ میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے والوں کو جو نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو اشخاص اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب عہد کریں اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں تنگدستی میں بیماری میں اور قتال میں یہ لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔

لیجئے سارے اسلام کا حاصل تقویٰ نکلا اس لیے سب کو چھوڑ کر تقویٰ اختیار کر لیجئے۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے اس لیے کہ جس طرح ہر ہر جزو کی روح علیحدہ ہے اسی طرح ہر عبادت کا تقویٰ جداگانہ ہے تو جو تقویٰ گوشت پوست کے ذریعے پہنچتا ہے اور حاصل ہوتا ہے وہ کسی دوسری عبادت سے کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ مثلاً زید کی روح کو گدھے کے قالب میں اگر منتقل کر دیا جائے تب بھی وہ زید نہ بنے گا بلکہ گدھا ہی رہے گا۔ اسی طرح صدقہ صدقہ ہی رہے گا۔ قربانی کا قائم مقام اسے کیسے کیا جا سکتا ہے تو دنیا میں تو بغیر صورت کے چارہ نہیں، اس لیے قربانی کرنی ہی پڑے گی۔ ہاں آخرت میں پہنچ کر آپ قربانی نہ کریں کیونکہ صورت ضروری نہیں۔ لیکن دنیا میں اگر آپ نے اعمال کی صورت کو ترک کر دیا تو یقین رکھیے کہ آپ نے اس کی روح کو بھی فنا کر دیا۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

مَا عَمِلَ ابْنُ اٰدَمَ مِنْ عَمَلٍ يَوْمَ النَّحْرِ

یعنی بقر عید کے روز سب سے زیادہ محبوب

اَحَبَّ الی اللہ مِنْ اھراق الدَّم - قربانی ہے

تو اس روز سوائے اس عمل کے دوسرا عمل کیسے اس کا قائم مقام ہو سکتا ہے۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ صحابہؓ نے عرض کی :-

یارسول اللہ ما ھٰذہ الاضاحی۔ یعنی یہ قربانیاں کیا چیز ہیں ؟

آپؐ نے ارشاد فرمایا :-

سُنَّۃ ابیکم اِبرَاھِیمَ یعنی تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سُنّت ہے۔

صحابہ نے استفسار کیا :-

فما لنا فیھا یارسول اللہ - یعنی یارسول اللہ اس سے ہمارا کیا فائدہ ہے ؟

آپ نے ارشاد فرمایا کہ :-

بِکُلِّ شعرۃٍ حسنۃ۔ یعنی قربانی کے ہر بال پر نیکی ملے گی۔

قربانی کی حقیقت

اصل میں قربانی کی حقیقت تو یہ تھی کہ عاشق خود اپنی جان کو خدا تعالیٰ کے حضور میں پیش کرتا۔ مگر خدا تعالیٰ کی رحمت دیکھئے کہ ان کو یہ گوارا نہ ہوا۔ اس لیے حکم دیا کہ تم جانور کو ذبح کرو ہم یہی سمجھیں گے کہ تم نے اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم کو خدا تعالیٰ نے خواب کے ذریعے بشارت دی کہ آپ اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسمٰعیل کی قربانی پیش کریں۔ اب دیکھیے یہ حکم اوّل تو اولاد کے بارے میں دیا گیا اور اولاد بھی کیسی۔ اور فرزند بھی ناخلف نہیں بلکہ نبیؑ معصوم ایسے بچہؑ کو قربان کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ حقیقت میں انسان کو اپنی قربانی پیش کرنا آسان ہے مگر اپنے ہاتھ سے اپنی اولاد کو ذبح کرنا بڑا سخت اور مشکل کام ہے۔ مگر حکمِ خداوندی تھا۔ اس لیے آپ نے بیٹے کی محبت کو پسِ پشت ڈالا اور حکمِ خداوندی کے آگے سر جھکا دیا۔ اور حضرت اسمٰعیل کو لے کر منیٰ کے منحر میں تشریف لے آئے۔ اور فرمایا کہ بیٹا مجھے خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ میں تجھ کو ذبح کر دوں تو حضرت اسمٰعیل نے فوراً فرمایا اِفْعَلْ مَا تُؤْمَرُ یعنی جو آپ کو حکم ہوا۔ وہ ضرور کیجئے۔ اگر میری جان انہیں چاہیئے، تو ایک جان کیا ہزار جانیں بھی ہوں تو نثار ہیں۔

چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے رسیوں سے انکے ہاتھ پاؤں باندھے چھری تیز کی۔ اب بیٹا خوش ہے کہ میں خدا کی راہ میں قربان ہو رہا ہوں ادھر باپ خوش ہے کہ میں اپنی قربانی پیش کر رہا ہوں۔ چنانچہ حکم خداوندی کی تعمیل میں اپنے بیٹے کی گردن پر چھری چلائی تو چھری کند ہوگئی اور اس وقت حکم ہوا۔

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ۔ یعنی بے شک آپ نے اپنا خواب سچا کر دکھایا ہم نیکوکاروں کو اسی طرح جزا دیا کرتے ہیں۔

اور اب ہم اس کے عوض جنت سے ایک مینڈھا بھیجتے ہیں اور تمہارے بیٹے کی جان کے عوض ایک دوسری جان کی قربانی مقرر کرتے ہیں چنانچہ اسی دن سے گائے، مینڈھا یا بکری وغیرہ قربانی کے لیے فدیہ مقرر ہوگیا۔ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ ذبیحہ کا اصل مقصد جان کو پیش کرنا ہے چنانچہ اس سے انسان میں جان سپاری اور جان نثاری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی اس کی روح ہے تو یہ روح صدقہ سے کیسے حاصل ہوگی کیونکہ قربانی کی روح تو جان دینا ہے اور صدقہ کی روح مال دینا ہے۔ پھر اس عبادت کا صدقہ سے مختلف ہونا اس طرح بھی معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ کا کوئی دن مقرر نہیں مگر اس کے لیے ایک خاص دن مقرر کیا گیا اور اس کا نام "یوم النحر" یعنی عید الاضحیٰ یعنی قربانی کا دن رکھا گیا۔ جہاں تک قربانی کے مسئلہ کا تعلق ہے۔ تو یہ سلفاً خلفاً ایسی ہی ہوتی چلی آئی انبیاء کا بھی اور امت کا بھی اس پر اجماع ہے۔ انبیاء بنی اسرائیل میں سب کے یہاں قربانی تھی۔ ائمہ کرام کا بھی اس پر اجماع ہے یہ اور بات ہے کہ امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ اور امام ابو یوسفؒ ان سب کے یہاں قربانی سنت ہے اور امام ابو حنیفہؒ وغیرہ کے نزدیک واجب ہے۔ اس حکم میں اختلاف اور ائمہ کے دقائق ہیں مگر قربانی میں سب متفق ہیں اور اگر یہ کوئی غیر شرعی عمل ہوتا تو احادیث میں اس کی صفات وغیرہ کیوں بیان کی جاتیں چنانچہ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ ہم کو حضورؐ نے ہدایت فرمائی :- ان نستشرف العین والاذن ۔ یعنی ہم قربانی کی آنکھ اور کان دیکھ بھال کر لیا کریں۔ وان ولا نضحی بمقابلۃٍ ولا مدابرۃٍ ولا شرقاءَ ولا خرقاءَ ۔ ہم نہ قربانی کریں ایسے جانور کی جس کا کان آگے سے کٹا ہوا ہو اور پیچھے سے کٹا ہوا ہو اور نہ چرا ہوا ہو اور نہ جس کے کانوں میں سوراخ ہو۔

اور اس کے علاوہ بھی بعض اوصاف مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کے احکام صدقہ سے بالکل جداگانہ ہیں اسلئے اس میں صدقہ کے احکام سے پرہیز کرنا ضروری ہے پھر ساری امت آج تک بلا اختلاف اس عمل کو کرتی چلی آئی اور تعامل سب سے بڑی دلیل ہے۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ

اللہ اللہ مخدوم کائنات گائے بیل کا ساجد بنا ہُوا تھا۔ زمین کا خلیفہ، نفخت فیہ من روحی کا پیکر لطیف، امانتِ الٰہیہ کا تنہا علمبردار، نباتات بلکہ جمادات جیسی بے شعور ہستیوں کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ عناصر مادی، بے جان ستارے، آفتاب و ماہتاب کے آگے ماتھا ٹیکے پڑا ہوا تھا عذابِ الٰہی کا یہ دہشت انگیز نظارہ تھا۔ کہ یکایک انہی میں سے ایک خوبصورت جوان نے ایک نعرہ مارا۔

انی وجهت وجهی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین۔ (قرآن)

مَیں نے رخ اس قوت کی طرف پھیر دیا جس نے آسمانوں اور زمین کو (ہستی سے) پھاڑ کر نکالا۔ مَیں اسی کی طرف جھکتا ہُوں مرے نزدیک اس کا کوئی ساجھی نہیں۔

دعویٰ تھا اور کتنا بلند دعویٰ تھا۔ اس کے گھرانے کے لوگ مخلوق ہی کے نہیں بلکہ مخلوق کی مخلوق اور انسانی مصنوعات کے گورکھ دھندوں میں اُلجھے ہُوئے تھے۔ وہ فانی ہاتھوں کو نہیں بلکہ فانی ہاتھوں کے بنائے ہُوئے بتوں کے ساتھ اپنے کو ربط دے رہے تھے۔ لیکن ان میں سے کیسا بلند ہمت نوجوان؟ جو جمادات و نباتات کی دلچسپیوں سے علیٰحدہ ہو کر، آفتاب و سیارات کی قہرمانیوں یا مہربانیوں کو ٹھکرا کر مادی کروں کو چیرتا ہُوا، مخلوقات کے دائروں کو پھاڑتا ہُوا، حتیٰ کہ ملائکہ مقربین

سے آنکھیں بچاتا ہوا خدا جانے کس غیبی کشش کی بدولت یکایک وہاں پہنچ گیا جہاں غنا تھا۔ فقر کو راہ نہیں ملتی تھی۔ جہاں صرف رب رہتا ہے۔ مرلوبات کی وہاں گنجائش نہیں جو واقعی سب سے بڑا تھا۔ اس نے بھی پالیا کہ وہی سب سے بڑا ہے۔ اللہ اکبر۔ جرأت اور کیسی جرأت۔

خلیلی امتحان

دعویٰ، امتحان سے ثابت ہوتا ہے۔ علم، عمل سے پختہ ہوتا ہے۔ امتحان لیا گیا عمل کے لیے حکم ہوا۔ جنگل کے گھپوں میں نہیں، پہاڑ کے غاروں میں نہیں بلکہ اسی سکھ اور دکھ کے آمیزہ میں، اسی حیرت کدہ میں۔ حکم ہوا کہ سلطنت سے ٹکر کھاؤ۔ اس نے کھالی۔ حکم ہوا آگ میں پھاند جاؤ۔ پھاند گیا۔ گھر چھوڑو۔ چھوڑ دیا۔ قحط و گرانی کی مصیبت جھیلو۔ جھیل لی۔ دوسروں کے دروازوں پر جاؤ۔ روانہ ہو گیا۔ یہ سب کچھ ہوا۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی تھا۔ کہ سورج اور چاند والے، گائے اور بیل والے پھلتے تھے۔ پھولتے تھے۔ اور اس کے سامنے یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ لیکن مخلوق والا نہیں خالق والا بے پھل کے تھا۔ اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ امتحان اور کڑا امتحان۔ دس نہیں، بیس نہیں اکٹھے ۸۵ سال کا لمبا امتحان، سب کی آنکھوں کے لیے روشنی تھی۔ لیکن جس کا دل روشن تھا اس کی آنکھ اس سے محروم تھی۔ مگر بڑھاپے کے ان سخت دنوں میں جو ہم پر سخت ہیں لیکن اس پر بہت آسان تھے۔ وہی جوانی کا نعرہ اس کی زبان پر جاری تھا۔ ہر راہ اور وادی میں وہ ان تمام باتوں کے بعد بھی یہی کہتا رہتا تھا۔

ان صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین۔ لاشریک لہ وبذالک امرت وانا اول المسلمین۔

میری پکار (میری پوجا) میری قربانیاں (اور منتیں) بلکہ میری زندگی میری موت (کسی مخلوق کے لیے نہیں بلکہ) اللہ کے لیے ہے۔ جو سارے جگ کا پالنہار ہے۔ اس کا کوئی ساجھی نہیں۔ مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے میں اپنا سب کچھ خدا کے سپرد کرتا ہوں اور اس کے آگے جھک جاتا ہوں۔

اس نے سب کچھ واپس کر دینے کا اعلان کیا تو لینے والے نے بھی اس سے جو جو کا حساب کر کے لیا۔ وہ قدرتی طور پر امین تھا۔ خیانت کی تاریکی اس کی روشن فطرت میں رہ نہیں سکتی تھی۔

جس وقت وہ آگ میں کودا تھا یہ سچ ہے کہ "ان تؤدوا الامانات الی اھلھا" (جس کی امانت ہو

اس کو ادا کر دو) کی پوری تعمیل کر چکا تھا۔ لیکن جتنا اپنے آپ کو دینا آسان ہے، اپنی تمناؤں کا دینا اتنا آسان نہیں۔ خودکشی اتنی مشکل تو نہیں جتنا خودکشی کے اسباب و وجوہ کا برداشت کرنا۔ بال بچوں کی پرورش کے لیے سپاہی اپنی گردن کٹاتا ہے۔ لیکن بال بچوں کی گردنوں کو کٹوانا اس کے بس میں نہیں ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سب کچھ مانگا گیا تو انہوں نے سب کچھ دے دیا۔ اپنے کو دے دیا۔ اپنی دھن اور وطن کو دے دیا۔ ہاں ایک مطالبہ، اور سخت مطالبہ، خلیل نے "جگر" دے دیا تھا لیکن "لختِ جگر" دینے کا موقع ان کو کہاں ملا۔ اپنی آنکھیں انہوں نے آگ میں جھونک دی تھیں لیکن جو آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ اس سے وہ کب دست بردار ہوئے تھے۔ بابر خود تو مر سکتا ہے لیکن ہمایوں کا گلا کس طرح گھونٹے۔ بالآخر وہ وقت بھی آگیا کہ ۸۵ سال کے بوڑھے کے گھر میں جو مصر کی شہزادی تھی اسے بچہ کی بشارت دی گئی۔ بچہ پیدا ہوا۔ اور اپنے وجود میں اس وجود اقدس کو لے کر دنیا میں آیا جس کے لیے ساری دنیا آئی اور جو ابراہیمؑ ہی کا نہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ ابراہیم کے خدا کا بھی مقصدِ محبوب تھا۔

بزرگ اور بوڑھے خلیل کا دل مطمئن تھا کہ یہ نونہال پھلے گا پھولے گا۔ بشارت مل چکی تھی خدا کے وعدہ پر خلیل نہ جیتے تو کون جیتا۔ لیکن صرف انسانیت کی نہیں بلکہ ایمان کی آزمائش کا بھی کتنا سخت وقت تھا۔ کہ ننانوے سال جس کے آستانہ پر پڑے رہے، پوری صدی جس کا مالا جپتے رہے اور جس کے قدموں پر دھن من سب کچھ لٹا چکے تھے اس کی طرف سے یکایک قربانی کا حکم آتا ہے۔ یہ حکم دل ہی نہیں بلکہ ایمان ہلا دینے والی بات ہے۔ لیکن خدائے غیر مسئول سے کون سوال کرے؟ احتجاج کر سکتے ہیں لیکن اواہ حلیم ابراہیم سے اس کی کیا توقع ہو سکتی تھی۔ حکومت کی راہ میں عائد سوال و جواب بھی ہو۔ لیکن عشق و محبت کی وادی میں تسلیم و رضاء، خاموشی اور خوشی کے سوا کسی چیز کی گنجائش نہیں اور واقعہ تو یہ ہے کہ ابراہیم کو سوال کا حق بھی تو نہ تھا۔ جو اپنی زندگی، اپنی موت، بلکہ اپنی ہر چیز کو خدا کے سپرد کر دینے کا اعلان کر چکا تھا۔ اور جو اپنے کو "مسلم" (سب کچھ سپرد کر دینے والا) کہتا تھا۔ اس کو دم مارنے کا کہاں موقع تھا۔ خلیل تُو اپنا معاہدہ تو پورا کر۔ خُدا اپنا وعدہ پورا کرے گا یا نہیں۔ اس سے تجھ کو کیا بحث۔ آخر یہی ہوا، بوڑھا باپ اٹھا اور اکلوتے کے سامنے آیا۔ اس کے سامنے آیا جس کی پیشانی سے اس کی دعاء چمک رہی تھی اور آکر

بولا" بیٹا! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ اب بتاؤ۔ تمہاری کیا رائے ہے ؟"
اکلوتے نے جواب دیا " اباجان! جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے کر گذریئے آپ مجھے انشاءاللہ تعالیٰ تھما ہوا پائیں گے"۔

۹۹ سال کا پیر بزرگ اباجان، شباب میں قدم رکھنے والے سیزدہ سالہ اکلوتے کو اپنے ساتھ لیتا ہے اس کے ہاتھ میں چھری ہے، کہا جاتا ہے کہ خلیلؑ نے آنکھوں پر پٹی باندھلی تھی۔ ہائے! مگر دل پہ کیا رکھا تھا اس کو کون سمجھ سکتا ہے۔ پہاڑ کے دامن میں آئے۔

اسلام کا بُنیادی پتھر

بوڑھے باپ نے اکلوتے کو پیشانی کے بل ٹپک دیا۔ اور اس کی گردن پر چھری چلادی جس کے ذبح ہو جانے سے کائنات ذبح ہو جاتی۔ پھر جیسا کہ ابراہیم کے ساتھ پرانا دستور تھا۔ کہ ابراہیم امانت سمجھ کر واپس کرتے تھے اور دینے والا انعام و جزاء کہہ کر اس سے کہیں زیادہ کر کے پھر ابراہیم ہی کی پلٹا دیتا تھا۔ آگ گلزار بنائی گئی۔ عراق چھوڑا تو شام کی زمین ملی۔ بُت تراشوں کے گھرانے کی بوڑھی بیوی کے ساتھ مصر کی جوان شہزادی عطاء ہوئی آج بھی وہی ہوا کہ آواز آئی۔

وناد یناان یا ابراھیم قد صدقت الرؤیا۔ انا کذالك نجزی المحسنین "ابراہیم! تم نے اپنے خواب کو پورا کر دیا۔ میں احسان و اخلاص والوں کو یونہی بدلہ دیا کرتا ہوں۔

وہ بدلہ کیا تھا؟ انی جاعلك للناس اماما (تمہیں ابراہیم! بنی آدم کی امامت دی گئی۔ اسی کی پشت سے، ہاں اسی بچے کے مطلع سے دنیا کا سب سے بڑا سردار، قوموں کا امام، ممکنات کا مرکزِ قیام وما ارسلنك الا کافة للناس بشیرا ونذیرا ہ کا پروانہ لے کر اسی پہاڑ کے دامن سے جہاں ابراہیمؑ نے اپنا آخری امتحان پورا کیا تھا، طلوع ہوا۔ بڑھا، چڑھا اور ساری دنیا پہ اس کی روشنی پھیل گئی پھیل رہی ہے اور پھیل جائے گی۔ خدا کا وعدہ پورا ہو گا۔ ابراہیمؑ کے اس امتحان نے امامتِ کبریٰ کو پیدا کیا۔

اگلے شمارہ میں

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم کی تقریر کی دوسری قسط، اولئك ھم الراشدون کی چوتھی قسط، حیاتِ شیخ الاسلام، حضرت مولانا عبدالمنان دہلوی مدظلہ کی عربی نعت، اور جناب احسان دانش کا نعتیہ کلام۔

خواب گاہِ قطب الارشادؒ

خاتم المحدثین، شیخ الاسلام والمسلمین، سند الاصفیاء الکاملین حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ کے حضور میں نذرانۂ نفیس

جیسا کہ قارئین کرام کو علم ہے کہ ادارہ کے کرم فرما اور معاون خصوصی محترم و مکرم حضرت سید انور حسین نفیس رقم لازالت معالیم شعبان کے آخر میں رائپور (انڈیا) تشریف لے گئے تھے۔ رمضان، شوال اور ذی قعدہ تینوں مہینے آپ انڈیا میں قیام فرما رہے۔ اس دوران میں آپ نے اکابر علماء و صلحاء سے شرفِ ملاقات حاصل کیا۔ بڑے بڑے اسلامی مدارس دیکھے اور متعدد زیارت گاہوں میں حاضری دی۔ قطب الاقطاب، امامِ ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کے مزارِ اقدس پر بھی دو مرتبہ حاضری کی سعادت حاصل کی۔ مزارِ پُر انوار کی زیارت کے وقت آپ کا دل جن جذباتِ محبت و شوق اور جس کیف و سرور سے معمور تھا اس کی معمولی سی جھلک ذیل کے اشعار میں دیکھی جا سکتی ہے۔ (ادارہ)

ہے یہ کس کی خوابگہِ حسیں، یہ نفیس کس کا مزار ہے
کہ نفس نفس کو سکون ہے تو نظر نظر کو قرار ہے

یہاں اِک نگار ہے خیمہ زن، یہ حریمِ حسنِ نگار ہے
یہاں محوِ جلوۂ سرمدی، وہ ہزار رشکِ بہار ہے

یہ فرودگاہِ رشیدؒ ہے، یہ مقامِ فردِ فرید ہے
یہ جو کہکشاں کی سی گرد ہے، اِسی گرد میں وہ سوار ہے

جو ابُو حنیفہؒ وقت تھا، جو کبھی بُخاریؒ عصر تھا
جو جُنیدؒ و شبلیؒ دہر تھا، یہ اُسی کی خاکِ مزار ہے

یہ مزار بُقعۂ نُور ہے، یہ جہانِ عشق کا طُور ہے
یہاں آفتابِ جمال ہے، یہ تجلّیوں کا دیار ہے

یہاں قُدسیوں کا نُزُول ہے، یہ دلیلِ حُسنِ قبُول ہے
یہاں سو رہا ہے وُہ نازنیں، جو نبیؐ کا عاشقِ زار ہے

جو کلامِ دوست کا نُور ہے، تو حدیثِ یار کا فیض ہے
اِسی فیض سے، اِسی نُور سے، یہ مزار قُمقُمہ زار ہے

یہ جُنُوں کا محملِ شوق ہے، یہ نظر کی منزلِ شوق ہے
مرا عشق حاصلِ شوق ہے، مرا عشق اِس پہ نثار ہے

وُہ کہ تھا مُجاہدِ شاملی، صفیں جس نے اُلٹیں فرنگ کی
اُسی صف شکن کی یہ گھات ہے، اُسی شیر کا یہ کچھار ہے

کبھی جام پینے پہ آ گئے، تو سمندروں کو چڑھا گئے
یہ جو آج تک نہیں ہوش ہے، مے عشق ہی کا خُمار ہے

یہ عنایتیں، یہ نوازشیں، ابھی آپ مُجھ سے نہ پُوچھیے
مری آنکھ محوِ جمال ہے، مرے سامنے رُخِ یار ہے

مَیں نگاہِ شوق کا کیا کروں ، دلِ ناصبُور سے کیا کہوں
ابھی حشر میں بڑی دیر ہے ، ابھی دُور روزِ شمار ہے

کوئی نکتہ چیں ہو ، ہُوا کرے مگر اے نگاہِ کمال بیں
ذرا کر کے دیکھ مُشاہدہ ، یہاں نُور ہے ، وہاں نار ہے

کِسی خشک طبع سے کیا غرض ، کِسی تنگ ظرف سے کام کیا
مری اہلِ دل سے ہے دوستی ، مجھے اہلِ درد سے پیار ہے

یہی میرا ناز و نیاز ہے کہ اسیرِ زُلفِ رشیدؒ ہُوں
اِسی سِلسلے کا مُرید ہُوں ، یہی میرا حُسنِ وقار ہے

مَیں فدائے عشقِ رسُولؐ ہُوں ، مَیں نبیؐ کے پاؤں کی دُھول ہُوں
مِرا دل خُدا کے حضُور میں ، بہ نیاز سجدہ گزار ہے

سہارنپور ۲۹ ذیقعد ۱۳۹۰ھ / ۲۷ جنوری ۱۹۷۱ء

محبِ عزیز جناب محمد احمد ساحل سہارنپوری سلمہٗ کی مہربانی سے مجھے دو مرتبہ مزار مبارک کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ یہ نظم انھیں کے نام معنون ہے ۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزاءِ خیر سے نوازے ۔ (نفیس)

★★★

تکبیر اور تعظیمِ شعائر اللہ کا مقدس دن

عید

شیخ الحدیث حضرت مولانا سیّد محمد میاں مدظلہم

لفظِ عید اور اس کی حقیقت "عید" عربی لفظ ہے۔ ہم اس کو نام کے طور پر استعمال کرتے ہیں جیسے "ہولی"، "دیوالی" ایک تیوہار مانا جاتا ہے۔ شب برات اور محرم کو تیوہار کہا جاتا ہے۔ ایسے ہی عید اور بقرعید بھی دو تیوہاروں کے نام سمجھے جاتے ہیں۔ مگر اپنے اصل و حقیقت کے لحاظ سے "عید" کے یہ معنے نہیں ہیں۔

عِید، عَوْد، عُوْد، عادت۔ ان سب الفاظ کا ماخذ ایک ہی ہے اور "بار بار" ہونے کا مفہوم اس ماخذ یعنی "عود" کا بنیادی نقطہ اور مرکزی مفہوم ہے۔ اس بناء پر ہر دن "عید" ہے۔ کیونکہ وہ بار بار آتا رہتا ہے۔ اور نہ صرف دن بلکہ ہر ایک رات اور ہر ایک شب و دیجور کو بھی "عید" کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کا چکر بھی برابر چلتا رہتا ہے۔ اور وہ بھی یکے بعد دیگرے مسلسل آتی رہتی ہے۔ لیکن محاورہ اور عرفِ عام نے کچھ حدیں قائم کر دیں۔ "ع ی د" کے اس لفظی قالب میں "مسرت اور خوشی کی روح پھونکی گئی ہے کامیابی اور بامرادی کا ہار اس کے گلے میں ڈالا گیا۔ اور اجتماعی زندگی کا تاج اس کے سر پر رکھا گیا۔ یعنی "عید" اس پُر مسرت اور بامراد دن کو کہا جانے لگا۔ جو اجتماعی اور قومی زندگی کی تاریخ میں کسی کامیابی اور کامرانی کا مالک ہو۔ اور اس کی یاد بار بار دلا کر جسم ملت کی سوکھی رگوں میں مسرت کی امنگ اور خوشی کی تازگی پیدا کرتا رہتا ہو۔

لفظ اور معنی کے تجزیہ اور تحلیل کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ لفظِ "عید" اپنے ماخذ کے لحاظ سے کچھ ہی معنے رکھتا ہو۔ مگر محاورہ اور عرفِ عام میں وہ "ہندی" لفظ "تیوہار" کا مفہوم ادا کرتا ہے۔

عید اور تیوہار میں فرق جہاں تک عربی لغت کا تعلق ہے عید اور تیوہار ایک ہی مفہوم کے دو نام ہیں۔ یعنی جس کو تیوہار کہا جاتا ہے۔ اسی کو عید بھی کہا جائے گا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ عرب کے قومی مذاق نے بھی عید اور تیوہار میں کوئی خاص فرق نہیں کیا تھا۔ بقول حضرت سید نا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ جس طرح ایران کے عجمی دو تیوہار "نوروز" اور "مہرجان" منایا کرتے تھے۔

مدینہ کے عرب بھی ان دونوں تیوہاروں کے عادی ہو چکے تھے۔ ایرانی ان دونوں تیوہاروں کے لیے فارسی الفاظ نوروز اور مہرجان استعمال کیا کرتے تھے۔ عربوں نے ان کے لیے اپنے یہاں کا ٹکسالی لفظ "عید" بولنا شروع کر دیا تھا۔ یعنی ایک ہی روح کے لیے دو قالب اور ایک ہی منشاء کی تعبیر کے دو عنوان تھے۔ ایک فارسی اور ایک عربی۔

خاتم الانبیاء رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ عزوجل کا آخری پیغام اور نوع انسان کے لیے مکمل ترین تہذیب لے کر مدینہ طیبہ پہنچے، تو آپ نے جس طرح قوم کی تمام عادتوں اور ان کے ہر ایک رسم و رواج پر تنقیدی نظر فرما کر اصلاح فرمائی۔ اس رسم پر بھی تبصرہ فرما کر اس کی اصلاح فرمائی۔ ابدلکم اللہ خیرا منھما، یوم الاضحی ویوم الفطر (یعنی اللہ نے ان دونوں کے بدلے میں دو تیوہار دیئے ہیں جو ان دونوں سے بہتر ہیں: "عید قربان" اور "عید الفطر") یعنی یہ حقیقت کہ خوشی کے دن ہوں۔ چھوٹے اور بڑے سب ہی حسب حیثیت عمدہ لباس پہنیں، بن سنور کر نکلیں۔ ملیں جلیں اور خوشی منائیں۔ اس حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ترمیم کر دی گئی کہ یہ دو دن نوروز اور مہرجان نہیں بلکہ فطر اور اضحیٰ کے دو دن ہیں۔

کیوں کیا معاذ اللہ قومی تعصب تھا جس نے یہ ترمیم ضروری قرار دی یا کوئی اصلاحی مقصد تھا جس کے لیے یہ ترمیم ضروری سمجھی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ دینِ فطرت یعنی اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ

"فطرت" کا گلا نہیں گھونٹتا۔ البتہ اس کی کج روی اور بے اعتدالی دور کر دیتا ہے۔ اس کا یہی فعل یہاں بھی ہوا ہے۔ یعنی فطری مطالبہ کو پورا کرتے ہوئے اس میں وہ خوبی پیدا کر دی گئی ہے کہ وہ صرف نفسانی اور مادی چیز ہی نہیں رہی بلکہ سراسر عبادت اور ایک روحانی حقیقت بن گئی ہے۔ اسلامی تعلیم کا حاصل یہ ہے کہ خوشی ضرور مناؤ۔ فطرت کے اس تقاضے کو کہ سال میں ایک دو روز ایسے ضرور ہوں جن میں اپنی تہذیب قومی اور ملی شان و شوکت کا مظاہرہ ہو۔ ضرور پورا کیا جائے۔ مگر ان دونوں کے مقرر کرنے اور منانے میں زمانۂ جاہلیت کا ذوق اور جاہلانہ جذبات کارفرما نہ ہوں۔ بلکہ اس کا محرک کوئی سچا اور پاک جذبہ ہونا چاہیئے۔

آباء پرستی حرام ہے، مادہ پرستی شرک ہے اور ایسا ترنگ اور ایسی عیش و عشرت جو جامۂ انسانیت کو چاک اور جبینِ تہذیب کو داغ دار بنا دے۔ خود تہذیب پر ظلم ہے۔ لہٰذا "عکاظ" اور "ذی المجاز" جیسے تیوہار اور میلے جن میں خاندانی عظمت اور آباؤ اجداد کے مفاخر میں فصاحت و بلاغت کی تمام طاقتیں صرف کر دی جائیں یا نوروز اور مہرجان جیسے تیوہار جن میں موسم بہار کے نام پر زندگی کی بہار میں بحران پیدا کیا جائے۔ اور خورد و نوش کی وسعت کو رقص و طرب کے دائرہ تک پہنچا کر عیش و عشرت کی داد دی جائے۔ یہ انسانیت و تہذیب و شرافت کی پیشانی پر بدنما داغ ہیں۔ ان میں سے ایک ایک کو مٹ جانا چاہیئے۔

یعنی اسلام کا بنایا ہوا تیوہار، نسلی برتری، خاندانی فخر و عظمت آباؤ اجداد کے مفاخر یا موسم بہار و خزاں کے مادی اثرات کی بنا پر نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ آباء پرستی کے بجائے خدا پرستی، خاندانی فخر و عظمت کے بجائے اخلاص و للّٰہیت اور عیش و عشرت کے بجائے ایثار و قربانی کے جذبات اس میں کارفرما ہونے چاہئیں۔ اور وہ دن ایسے ہوں کہ ان سے اگر یاد ہو سکے تو انہیں پاک جذبات کی اور انہیں مقدس رجحانات کی۔ تاکہ انسانی فطرت کا تقاضا اسی طرح پورا ہو کہ عبدیت و بندگی، خدا پرستی اور انسانی شرافت و عظمت کے آثار بھی نمایاں رہیں۔ اور اسلام جس انسانیت کی تعلیم دیتا ہے اس کی زندہ تصویر سامنے آسکے۔ اور یہ جو انفرادی طور پر زندگی کا نصب العین اِن الہامی الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے

ان صلواتی ونسکی ومحیای ومماتی للّٰہ رب العالمین (بے شک میری نماز، میری قربانی میری زندگی اور میری موت سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے) یہ مقدس نصب العین اجتماعی صورت میں بھی سامنے آجائے۔

اسلام نے خدا پرستی کی تصویر میں اخلاص و صداقت کا رنگ بھرنے کے لیے سب سے پہلے روزے کی تلقین کی ہے۔ جس کی شان اخلاص کا اندازہ حدیثِ قدسی کے اس جملہ سے ہوسکتا ہے۔ الصوم لی وانا اجزیٰ بہ (روزہ صرف میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزاء دونگا) اخلاص و ایثار اور قربانی کی آخری حد وہ ہے کہ انسان سب کچھ حتیٰ کہ آل و اولاد کو بھی قربان کر ڈالے۔

اسلام نے فطرتِ انسان کو دعوت دی کہ شان و شوکت، زیبائش و آرائش اور انبساط و مسرت کی تمام جلوہ آرائیاں، اخلاص و صداقت کے انہیں دو محوروں پر ہونی چاہئیں۔

۱۔ جب ماہ رمضان ختم ہوا اور ایک خدا پرست، ایثار و اخلاص، خدمتِ خلق اور ہمدردیٔ نوع کا ایک کورس پورا کر چکے ہیں۔ اس کا نام عید الفطر ہے یعنی مسرت کا وہ دن جس کا محرک اور منبع یہ ہے کہ رمضان المبارک کا مہینہ گذارنے کے بعد آج روزہ کشائی ہوئی ہے۔

۲۔ جب والہانہ جذبات کے ساتھ اس "بیت عتیق" میں حاضری ہو جس کے بانی (حضرت ابراہیم علیہ السلام) نے پہلے اس "وادیٔ غیر ذی زرع" میں اپنی مالوفات (رفیقۂ حیات حضرت ہاجرہ اور شیر خوار لختِ جگر حضرت اسمٰعیلؑ) کو چھوڑ کر اس کے بعد انسانی تمناؤں کے آخری سہارے کو قربان کر کے عاشقانِ پاک طینت کے لیے مقدس مثال قائم کی تھی۔

یہ دو عیدیں ہیں جن کی اسلام نے تعلیم دی ہے ان کے سلسلہ میں لکھنے اور کہنے کی باتیں تو بہت کچھ ہیں مگر مناسب اور بہتر یہ ہے کہ قول کی بجائے فعل کی طرف توجہ دی جائے

وفا ملک پوری

عید کس کی ہے؟

جس نے دنیا میں کیا ہو آخرت کا بندوبست
جو نہ بھولا ہو غمِ ہستی میں اقرارِ الست
کر دیا ہو اپنی بیجا خواہشوں کو جس نے پست
جس نے اپنے نفسِ امارہ کو دیدی ہو شکست
فرق کچھ آئے نہ جس کے عزم و استقلال میں
راہِ حق پر جو رہے ثابت قدم ہر حال میں

جس کے ایماں کی حرارت قلب کو دے سوز و ساز
جو سمجھتا ہو خدائے پاک کی طاعت کا راز
آنکھ کی ٹھنڈک ہو جس کے واسطے ذوقِ نماز
سر جھکا کر سجدۂ خالق میں جو ہو سرفراز
کامراں جس کی وفا ہو ہر جفا کے سامنے
جس کی پیشانی جھکی ہو بس خدا کے سامنے

بھول کر بھی امرِ حق سے ہو نہ جس کو اختلاف
کعبۂ دل کی حفاظت جو سمجھتا ہو طواف
جس کے دل کا آئینہ گردِ کدورت سے ہو صاف
جس کے حسنِ خلق کا دشمن کو بھی ہو اعتراف
جو غم و اندوہ میں بھی مسکراتا ہی رہے
زیرِ خنجر بھی پیامِ حق سناتا ہی رہے

عید اس کی ہے مے وحدت سے جو سرشار ہو
عید اس کی ہے جو اہلِ درد کا غمخوار ہو
خلق میں امن و صداقت کا علمبردار ہو
خوگرِ درد محبت، پیکرِ ایثار ہو
عید اس کی ہے جو احساس وفا سے کام لے
عید اس کی ہے کہ جو گرتے ہوؤں کو تھام لے

ایک مقدس تقریب کی روداد

۲۳ ذی قعدہ کو حضرت مہتمم صاحب مدظلہم کے صاحبزادہ محترم سید محمود میاں کے ختمِ قرآن پاک کے موقع پر جامعہ مدنیہ میں ایک پُر وقار تقریب منعقد ہوئی اس مقدس تقریب میں شیخ الحدیث حضرت علامہ مولانا مفتی محمود صاحب دامت برکاتہم، حضرت مولانا سید گل بادشاہ صاحب حضرت مولانا عبدالغفور صاحب اور بہت سے دوسرے مہمان علمائے کرام اور جامعہ کے اساتذہ کرام طلبہ اور بہت سے مقامی حضرات نے شرکت فرمائی۔ حضرت مفتی صاحب ادام اللہ معالیہم نے ختم قرآن کرایا اور حضرت مولانا گل باشاہ صاحب نے پشتو زبان میں رقت آمیز دعا فرمائی۔ دعا کے بعد حضرت مفتی محمود صاحب مدظلہم نے "حفاظت و فضائل قرآن پاک" کے موضوع پر تقریر فرمائی جو پیشِ خدمت ہے۔

میں "ختمِ حفظِ قرآن" کی اس بابرکت تقریب میں حاضری کو اپنے لیے موجب سعادت و فخر سمجھتا ہوں قرآن پاک وہ کتاب ہے کہ جس کی اشاعت اور حفاظت ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اور جس پر عمل کرنا ہر مسلمان کے لیے از بس ضروری ہے۔ اس وقت تک کوئی بھی شخص صحیح معنیٰ میں "مسلمان" تو کیا انسان کہلانے کا بھی مستحق نہیں ہے۔ جب تک کہ وہ قرآن پر عامل نہ ہو۔ ہر مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اسے سینے سے لگائے رکھے۔

اس کی حفاظت و اشاعت میں دن رات ایک کر دے۔ اس وقت شدید ضرورت ہے کہ قرآن حکیم کے الفاظ اور معانی کو محفوظ کیا جائے۔

آج مخالفین اور دشمن، قرآن کے الفاظ ختم کرنے اور ان میں ردوبدل کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اور

اس کے معانی بدلنے پر بھی ہر طرح زور صرف کر رہے ہیں۔ جیسا کہ آپ نے سُنا ہوگا یہودیوں نے قرآن پاک میں تحریف لفظی کر کے اسے بہترین کاغذ پر بہترین اور شاندار طرح سے طبع کیا اور پھر لاکھوں کی تعداد میں اسے تقسیم کیا۔ لیکن مسلمانوں نے اس پر احتجاج کیا۔ اور مرحوم ناصر نے محمود خلیل حصری سے باقاعدہ پورا قرآن ٹیپ ریکارڈ کرایا۔ اور مختلف ملکوں میں اسے بھیجا۔ اس کے علاوہ صدر ناصر نے ایسے ہی شاندار طریقہ پہ قرآن صحیح طرح پر چھپوا کر تقسیم کیا۔ اور اس طرح دنیا کے مسلمانوں اور صدر مرحوم نے دشمنوں کی اس مذموم کوشش کو ناکام بنا دیا۔

ایسے ہی ایک دفعہ لبنان اور بیروت میں کچھ مستشرقین نے قرآن کو ترتیب نزولی کے ساتھ چھاپا چنانچہ سب سے پہلے جو سورۃ نازل ہوئی تھی سورۃ فاتحہ کی جگہ پر اسے رکھا۔ اور اس کے بعد اسے رکھا جو دوسرے نمبر پر نازل ہوئی تھی۔ گویا موجودہ ترتیب کی بجائے ایک نئی ترتیب قائم کی۔ مسلمانوں نے اس کے خلاف بھی شدید احتجاج کیا۔ اور ان مستشرقین کا یہ حربہ ناکام بنا دیا۔ چنانچہ موجودہ ترتیب جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی ہے کے مقابلہ میں نئی ترتیب جس کا صحیح علم بھی نہیں مسلمانوں میں رواج نہ پا سکی۔ مختصر یہ کہ خدا تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہوئی ہے۔ وہ اس کے الفاظ اس کے معانی اور اس کی ترتیب، سب کا محافظ ہے۔ اور اس کام پہ اللہ تعالیٰ نے مختلف جماعتیں مامور فرمائی ہیں۔ علماء معانی اور حفاظ الفاظ کی حفاظت کر رہے ہیں گویا انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون کا وعدہ مختلف صورتوں اور مختلف شکلوں سے پورا ہو رہا ہے۔

تو طلبہ، علماء اور حفاظ کا مرتبہ اس لحاظ سے کہ وہ خدا کے کلام کی حفاظت کر رہے ہیں سب سے بلند ہے۔ دنیا میں کوئی بھی ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

ایک زمانہ تھا کہ اس وقت علم دین حاصل کرنے کے بعد علماء کو مناصب ملتے۔ عہدے ملتے۔ کوئی قاضی بنتا۔ کوئی کچھ بنتا کوئی کچھ۔ اس لیے اس زمانہ میں علم پڑھنے والوں کے مقاصد دو طرح کے ہو سکتے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ ان کا مقصد خیر ہو۔ اور وہ تعلیم کے بعد دین کی خدمت انجام دیں۔ اور ہو سکتا تھا کہ مقصد خیر نہ ہو۔ بلکہ وہ علم مناصب اور عہدوں کے حصول کے لیے حاصل کرتے ہوں۔ لیکن اس زمانہ میں تو سوائے خیر کے دوسرا مقصد ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ مدارس سے فارغ ہونے کے بعد آپ کے لیے ملک بھر میں کوئی عہدہ کوئی منصب نہیں ہے۔ اس لیے اس وقت کے طلبہ کا

مقصد خیر کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا۔

حدیث شریف میں ایسے لوگوں کے بارے میں جو علم کو دنیاوی مقاصد کے لیے حاصل کرتے ہیں فرمایا گیا ہے کہ من تعلم علما مما یبتغی بہ وجہ اللہ لا یتعلمہ الا لیصیب بہ عرضا من الدنیا لم یجد عرف الجنۃ یوم القیٰمۃ ۔ یعنی جو شخص ایسا علم حاصل کرتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رضاء حاصل ہوتی ہے اور وہ دنیا کے لیے اسے حاصل کرتا ہے تو ایسا شخص قیامت کے دن جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکے گا۔

اس لیے علم کو خالص اللہ کی رضاء کے حصول کی غرض سے حاصل کرنا چاہیئے۔ اس مقصد سے علم حاصل کرنا بہت بڑی سعادت ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم حاصل کرنے والوں کے متعلق صحابہؓ کو وصیت فرمائی ہے کہ ان الناس لکم تبع وان رجالا یأتونکم من اقطار الارض یتفقھون فی الدین فاذا اتوکم فاستوصوا بھم خیرا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ لوگ تمہارے تابع ہیں اور اطراف عالم سے تمہارے پاس بہت سے آدمی علم دین سیکھنے اور دین میں سمجھ حاصل کرنے کے لیے آئیں گے۔ سو جب وہ تمہارے پاس آئیں تو میں تمکو وصیت کرتا ہوں کہ ان کے ساتھ بھلائی سے پیش آنا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراط مستقیم پر چلائے۔ اور آخرت میں رسول کریمؐ کا ساتھ نصیب فرمائے۔ ملک کو استحکام بخشے۔ اور جلد وہ وقت لائے کہ یہاں شرعی قوانین کا نفاذ ہو۔ آمین!

خریداری نمبر

اب کے لفافہ پر جو نئے خریداری نمبر درج ہیں، آئندہ خط و کتابت کرتے وقت انہی کا حوالہ دیجئے۔ براہ کرم ان نئے نمبروں کو یاد رکھیے اور ہمیشہ ان کا حوالہ دے کر ادارہ کو خط لکھیے۔ ——— (ادارہ)

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہ مفتی دار العلوم دیوبند

احکام عید الاضحیٰ

نماز عید

بقر عید کی نماز بھی مثل نماز عید الفطر کے واجب ہے اور ترکیب اس نماز کی وہی ہے جو نماز عید الفطر کی ہے۔ اور وقت اس کا آفتاب کے بلند ہونے سے زوال سے پہلے تک ہے۔ البتہ جلد پڑھنا اس نماز کا مستحب ہے۔ تاکہ اس کے بعد قربانی کرنے میں سہولت ہو۔ نماز کے بعد امام خطبہ پڑھے جس میں قربانی اور تکبیرات تشریق وغیرہ کے احکام بتلائے۔ اس نماز کے لیے بھی باہر عیدگاہ میں جانا مستحب ہے اور راستہ میں پکار کر تکبیر پڑھتا رہے تاکہ دونوں رستے گواہی دیں۔ بقر عید کی نماز سے پہلے کچھ کھانا اچھا نہیں۔ اگرچہ حرام بھی نہیں، بہتر یہ ہے کہ بعد نماز کے قربانی میں سے کھاوے۔

تکبیر تشریق

تکبیر تشریق ایک دفعہ ہر ایک نماز فرض کے بعد جو جماعت سے پڑھی گئی ہو کہنا واجب ہے۔ امام اور مقتدی سب ایک بار اس طرح تکبیر کہیں اللّٰہُ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد نویں ذی الحجہ کی صبح سے تیرھویں تاریخ کی عصر تک۔

قربانی کے احکام

ہر ایک مسلمان آزاد مقیم جس پر صدقہ فطر واجب ہے ایک بکرا یا بھیڑ یا دنبہ یا ساتواں حصہ گائے۔ بیل۔ بھینس، اونٹ کا قربانی کرنا واجب ہے۔ اور ایک گائے بیل وغیرہ میں سات آدمی تک شریک ہو سکتے ہیں۔ اگر دو یا تین یا چار یا پانچ یا چھ آدمی شریک ہو کر پوری گائے کریں تب بھی درست ہے۔ بکرا، بکری ایک برس کا پورا ہونا چاہیئے۔ اور گائے بیل۔ بھینس دو برس کی اور اونٹ پانچ برس کا اور گائے کی قربانی بہتر ہے بیل سے۔ اور مینڈھا بہتر ہے بھیڑ سے

اور بکرا بکری میں مادہ بہتر ہے نر سے۔ کذا فی الدر المختار۔ دنبہ دنبی اور بھیڑ اور مینڈھا چھ ماہ سے زیادہ کا بھی درست ہے بشرطیکہ موٹا اور تیار ہو کہ ایک برس کا معلوم ہوتا ہو۔

قربانی کا گوشت وزن سے تقسیم کیا جائے اندازہ سے تقسیم نہ کریں۔ لیکن اگر کسی طرف پائے یا کھال بھی لگا دی جائے تو اندازہ سے بھی تقسیم کرنا درست ہے۔

شہر والے قربانی بعد نماز کے کریں اور اگر کسی عذر سے اس دن نماز ادا نہ ہوئی تو جس وقت نماز کا وقت گذر جائے اس وقت قربانی کرنا درست ہے۔ یعنی بعد زوال کے اور دوسرے تیسرے دن نماز سے پہلے بھی قربانی درست ہے۔ یعنی اگر نماز بقرعید کی کسی عذر سے قضا ہو گئی تو اگلے دن نماز سے پہلے بھی قربانی جائز ہے۔ اسی طرح بارہویں تاریخ کو بھی۔ اور گاؤں والوں کو صبح صادق ہونے کے بعد قربانی کرنا درست ہے۔

قربانی کے دن تین ہیں۔ دسویں۔ گیارہویں۔ بارہویں ذی الحجہ مگر پہلے دن قربانی کرنا افضل ہے پھر دوسرے دن۔ پھر تیسرے دن اور تیسرے دن غروب آفتاب سے پہلے قربانی ہو سکتی ہے۔

رات کو قربانی کرنا جائز ہے۔ پسندیدہ اور بہتر نہیں۔

اپنی قربانی کو خود ذبح کرنا بہتر ہے اگر خود ذبح کرنا نہیں جانتا تو دوسرے سے ذبح کرانے کے وقت خود وہاں کھڑا ہو جانا بہتر ہے۔ قربانی کے وقت کوئی نیت زبان سے پڑھنا یا دعا پڑھنا ضروری نہیں اگر صرف دل میں خیال کر لیا کہ میں قربانی کرتا ہوں اور زبان سے کچھ نہیں کہا صرف بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کر دیا تب بھی قربانی درست ہے۔ لیکن اگر دعائے ماثورہ جو آگے آتی ہے پڑھے گا تو بہتر ہے اور ثواب زیادہ ہے۔

جب قربانی کو قبلہ رخ لٹا دے تو یہ دعا پڑھے:-

انی وجهت وجهی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین۔ ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین لا شریک لہ وبذالک امرت وانا اول المسلمین۔

ذبح کرنے کے بعد یہ دعا پڑھے :-

اللھم تقبلہ منی کما تقبلت من حبیبک محمد و خلیلک ابراھیم علیھما الصلوٰۃ و السلام۔

بہتر یہ ہے کہ قربانی کا گوشت ایک تہائی غربا و مساکین پر صدقہ کرے۔ ایک تہائی اپنے دوستوں کو دے اور ایک تہائی اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے رکھ لے۔ لیکن جس شخص کے کنبہ بہت ہو یا اور کوئی ضرورت ہو تو تمام گوشت خود خرچ کر سکتا ہے۔ البتہ فروخت کرنا منع ہے۔

جس کے ذمہ قربانی واجب نہ تھی اگر اس نے قربانی کی نیت سے کوئی جانور قربانی کا خریدا تو اس کے ذمہ اس کا قربانی کرنا واجب ہو گیا۔ اس کو فروخت نہیں کر سکتا۔ اگر قربانی کے دن گذر گئے اور اس نے اس جانور کو ذبح نہ کیا تو زندہ کو اللہ واسطے محتاجوں کو دے دینا چاہیئے۔ نذر کرنے والے کا بھی یہی حکم ہے۔

جس شخص کے ذمہ قربانی واجب ہے۔ اگر قربانی کے دن گذر جائیں اور وہ قربانی نہ کرے تو قربانی کی قیمت صدقہ کرنا ضروری ہے۔

جس جانور کے سینگ پیدائشی نہ ہوں اس کی قربانی درست ہے اور اگر بیچ سے ٹوٹ گیا ہو تب بھی قربانی درست ہے اگر جڑ سے اکھڑ گیا ہو تو درست نہیں اور بدھیا کی قربانی بھی درست ہے خواہ مل کر بدھیا کیا گیا ہو۔ یا نکالکر۔ اندھے اور کانے کی قربانی درست نہیں اور ایسے دبلے جانور کی قربانی بھی درست نہیں جس میں مغز نہ رہا ہو۔ اور نہ ایسے لنگڑے کی جو مذبح تک نہ جا سکے۔ اور نہ ایسے بیمار کی جس کی بیماری ظاہر ہو۔ اور نہ ایسے جانور کی جس کا تہائی سے زیادہ کان کٹا ہوا ہو۔ یا تہائی سے زیادہ دم کٹی ہوئی ہو۔ اور نہ اس کی جس کے کان بالکل نہ ہوں اور نہ اس کی جس کے دانت نہ ہوں البتہ اگر تھوڑے سے گر گئے اور زیادہ باقی رہ گئے تو جائز ہے۔

چرم قربانی کو بدون فروخت کرنے کے اپنے کام میں لا سکتا ہے یعنی ڈول وغیرہ اس سے بنا سکتا ہے۔ خود اس کو فروخت نہ کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر فروخت کر دیا تو فروخت کرنے کے بعد اس کی قیمت

کا صدقہ کرنا واجب ہے۔ اور اجرت قصاب کی قربانی میں سے دینا جائز نہیں اور عالمگیریہ میں ایک روایت ہے کہ چرم قربانی کو صدقہ کرنے کے لیے فروخت کرنا درست ہے۔

چرم قربانی یا اس کی قیمت کو کسی معاوضہ میں دینا مثلاً امام مسجد و موذن کو بسبب اس کی امامت و اذان کے دینا درست نہیں ہے۔

بحمد اللہ اِمسال جامعہ مدنیہ میں ایسے طلبہ ایک سو ساٹھ کے قریب ہیں جو اطراف واکناف سے آئے ہیں اور ان کے مصارف خورد و نوش اور رہائش و تعلیم۔ تیمارداری اور دیگر ضروریات لباس وغیرہ بذمہ جامعہ ہیں۔ لاہور شہر میں طلبۂ عربی کی یہ تعداد سب مدارس سے زیادہ ہے

فللہ الحمد

آپ کے جملہ عطیات کا اس سے بہتر مصرفِ خیر اور کیا ہوگا؟

ان کے علاوہ مقامی بچوں سمیت تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد تقریباً پانچ سو ہے۔ ماہانہ مصارف مطبخ و اساتذہ و عملہ سات ہزار روپے ہیں۔

آپ حضرات سے استدعا ہے کہ علاوہ چرم قربانی کے دائمی طور پر حسب استطاعت کچھ نہ کچھ ماہانہ امداد میں حصہ لیں تاکہ آپ کا یہ صدقہ جاریہ مزید ترقی پذیر ہو۔

نیوز کے بجائے سفید کاغذ

ہمارے بہت سے احباب نے ہمارے اس فیصلہ کو پسند نہیں کیا کہ رسالہ بجائے سفید کاغذ کے معمولی کاغذ پر چھپتا رہے گا۔ اکثر احباب نے یہ مشورہ دیا ہے کہ رسالہ کے صفحات میں تو کمی کر دی جائے لیکن کاغذ بڑھیا ہی رہے۔ تاکہ رسالہ کی پائیداری اور حسن و زینت برقرار رہے۔ چنانچہ کارکنانِ جامعہ نے ان کے اس مخلصانہ مشورہ کو قبول کر لیا ہے۔ اب انشاء اللہ رسالہ اچھے سفید کاغذ پر شائع ہوا کرے گا۔ (ادارہ)